TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222770
UNIVERSAL
LIBRARY

میری شاعری

یعنی

انتخابِ کلام مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت

تاریخی نام انتخاب افصح الکلام

۱۳۵۵ ہجری

مطبع زندہ طلسمات فائن آرٹ لیتھو پریس میں چھپا

۵۰۰ جلد — قیمت عہ علاوہ محصولڈاک

میری شاعری

دنیا میں شاعری کی تعریف لوگوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے۔ مگر وہ ایک بھی اردو شاعری پر پوری نہیں اترتی۔ اور کیوں اترنے لگی جب اس شاعری کی دنیا ہی نرالی ہے۔ میری رائے پوچھو تو اردو شاعری سے مراد "ایسے واقعات کا جو نہ دیکھے گئے ہوں اور نہ دیکھے جا سکتے ہوں ایسے حالات کا جو نہ سنے گئے ہوں اور نہ سنے جا سکتے ہوں۔ ایسی کیفیات کا جو نہ دل پر گذری ہوں اور نہ گزر سکتی ہوں چند بحروں میں اس طرح نظم کر دینا ہے جو بازاروں میں لونڈے جلسوں میں اربابِ نشاط اور مشاعروں میں خود شاعر گا سکیں" اب رہا مضموں کا الفاظ میں ادا کرنا۔ تو اسکی تین قسمیں ہیں۔ اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ قسم تو یہ ہے کہ جو لکھا جائے اسکو نہ لکھنے والا سمجھ سکے اور نہ پڑھنے والا۔ مگر الفاظ کا رعب داب سب کو واہ واہ کرنے اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور کرے۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے لکھے کو سمجھ سکے مگر پڑھنے والے کی خاک سمجھ میں نہ آئے یا لکھنے والا خود نہ سمجھے مگر سننے والے سمجھ جائیں۔ ایسی صورت میں یا تو لکھنے والا اپنی تعریف خود کرتا ہے اور سننے والے نہیں سمجھتے کہ یہ تعریف

لہ شعراء عظام میرے اس ہرزہ درائی کو معاف فرمائیں۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اور مجھ جیسے نااہل کی رائے کیا بگاڑ سکتی ہے۔

کیوں کی جاری ہے ۔ یا سننے والے اس کی تعریف کرتے ہیں اور پڑھنے والا نہیں سمجھتا کہ یہ کیوں ہو رہی ہے ۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ خیالات ایسے پست اور الفاظ ایسے معمولی ہوں کہ ان کو لکھنے والا بھی سمجھے اور سننے والے بھی سمجھ جائیں ۔ تعریف میں ہر شخص "واہ نہ" کہے اور شاعر بھی یہ سوچ کر بُرا نہ مانے کہ اس کے لکھنے میں مجھے محنت ہی کونسی اٹھانی پڑی تھی ۔ بدقسمتی سے میں بھی اس ادنیٰ طبقہ شعرا میں داخل ہو گیا ہوں یا داخل کر دیا گیا ہوں ۔ ورنہ مجھے شاعری سے کیا سروکار ۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کو اللہ گھر بیٹھے رزق دیتا ہے ۔ اور مجھے اس کشمکس زندگی میں گزارہ کرنے کے لئے آنکھوں کا تیل نکالنا پڑتا ہے ۔ باوجود اسکے مجھے شاعر بننا پڑا ۔ شاعر کس طرح بنا اس کا حال بھی سن لیجئے ۔

ہوا یہ کہ میرے ایک دوست میاں دانی[1] ولایت گئے ۔ اور گئے بھی ایسے کہ آدھی دنیا کا چکر کاٹ آئے ۔ بیٹھے بیٹھے ایک پُرانا مصرع میرے دھیان میں آیا ۔ ابجد سے اسکا جو حساب لگایا تو ان کی واپسی کا سنہ نکل آیا ۔ شوق ہوا کہ قطعہ تاریخ ہو جائے تو اچھا ہے ۔ تھوڑی بہت فکر سے اللہ نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ۔ قطعہ ہوا کہ

پھر پھرا کر میاں دانی جو سفر سے آئے ۔۔۔ بار تاریخ کا ڈالا گیا مرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو ۔۔۔ میں بھی شاعر ہوا اللہ کی قدرت ہے مگر
میرے انکار سے احباب نہ سمجھیں ہوں ۔۔۔ اسلئے لکھتا ہوں تاریخ بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیال گلشن ۔۔۔ پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آگیا صیاد کے دل میں شاید ۔۔۔ ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا ۔۔۔ پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لئے ۔۔۔ خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر

[1] یہ وہی بزرگوار ہیں جو ساری دنیا میں مسٹر غلام یزدانی ایم ۔ اے ۔ او ۔ بی ۔ ای کے نام سے مشہور ہیں اور آثار قدیمہ کے ماہر مانے جاتے ہیں ۔

بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کبتک — ہوتا کبتک نہ زمانہ کے تغیر کا اثر
آب و دانہ اُسے پھر کھینچ کو لایا سوئے دام — باندھے صیاد نے پھر طائر آزاد کے پر
لکھی فرحت نے ہی کس نور سے فصلی تاریخ — پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

۲۱۳ + ۱۱۲۰ = ۱۳۳۳ ف

اس کے بعد پھر میری شاعری معرضِ التوا میں آگئی۔ اور آنی بھی چاہیے تھی۔ کیونکہ یہ قطعہ صرف ایک مصرع کی خاطر لکھا گیا تھا نہ کہ شاعر بننے کے لئے۔ ایک دفعہ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے مجھے جوش بھی دلایا اور کہا کہ "تیری فطرت میں شاعری ہے۔ تیری خاموشی کفرانِ نعمت ہے"۔ مگر میں انکی باتوں میں کب آنیوالا تھا "بہت خوب اور جی ہاں" کہہ کر بات ٹال دی۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں مجھے اردو سوسائٹی مدراس کے سالانہ جلسہ میں صدر بن کر جانا پڑا واپس ہوا تو گاڑی میں اکیلا تھا۔ چوبیس گھنٹے کا سفر اور تنہائی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ہی طبیعت گھبرا گئی۔ کتاب اٹھا کر دیکھی مگر دل نہ لگا۔ اخبار اٹھایا مگر وہ تھوڑی ہی دیر میں ختم ہوگیا۔ اسوقت خیال آیا کہ شاعری شروع کرو کیونکہ بیکاری میں اس سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی وحید الدین مرحوم کی بات یاد آئی۔ اٹھا۔ ٹہلا۔ گنگنایا۔ اور ایک شعر دماغ سے اتر کر زبان پر آگیا۔ شعر کیا ہے میری اس وقت کی حالت کا آئینہ ہے۔ عرض کیا ہے۔

مجھے ہے شاعری کا آجکل جوش — ہوئے ہیں دین و دنیا سب فراموش

اسکے بعد ضرورت ہوئی کہ کوئی غزل کہی جائے۔ کیونکہ اردو شاعری کی یہی شاہراہ عام ہے نہ اس میں خیالات کی وسعت کی ضرورت ہے اور نہ الفاظ کے انتخاب کی حاجت۔ کئی ردیف اور قافیے خیال میں آئے۔ مگر بلا وجہ نظر انداز کردئے گئے۔ آخر "انداز۔ آغاز" کے قافیوں اور "ہے" کی ردیف نے شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ الفاظ نے مصرعوں اور مصرعوں نے غزل کی شکل اختیار کرنی شروع کی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک عدد غزل کے

موجد ہو کر شاعروں کی صف میں آ گئے ۔ غزل ہوئی تھی ۔

کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے — تیری صورت پر ید قدرت کو کیا کیا ناز ہے
ہر نگاہ ناز گویا تیر بے آواز ہے — اسکی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے
کچھ اگر سمجھو تو بیشک دل ہے گھر اللہ کا — جو ندا اسکی ہے کوہ طور کی آواز ہے
حسن طالب عشق کا اور عشق طالب حسن کا — تم کو مجھ پر ناز ہے اور مجھ کو تم پر ناز ہے
بے نیازی اور تیرا ناز کچھ ہیں ایک سے — فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے
ہر قدم پر موت ہے کل حوادث پای بوس — یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے
ہاں نہ پوچھ آئینۂ دل کی کیفیت نہ پوچھ — یہ وہ گنجینہ ہے جس میں دو جہاں کا راز ہے
اے حریص زندگی کیوں موت سے ڈرتا ہے تو — زندگی دائمی کا موت ہی آغاز ہے

مجھ کو فرحت شاعری میں دخل تو ہرگز نہیں
ہاں مری غزلوں کا بیشک اک نیا انداز ہے

مقطع میں تعلی کے علاوہ صریح جھوٹ بھی ہے ۔ صرف ایک غزل لکھنے کے بعد کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ پڑھنے والوں کو یہ باور کرائے کہ میں بہت سی غزلوں کا مالک ہوں ۔ اور وہ سب دنیا بھر سے نرالی ہیں ۔ ارادہ ہوا تھا کہ "غزلوں" کی جگہ "شعروں" لکھ دوں ۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح رعب کم ہو جائیگا اسلئے جھوٹ کو بحال خود رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا ۔

جس طرح ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو چاہتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی پہلی غزل پر لوٹ ہو گیا ۔ اتنا پڑھا ۔ اتنا پڑھا کہ سارا راستہ اسی پڑھنے میں کٹ گیا ۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ تو نے کچھ دنوں پہلے سے شاعری کیوں شروع نہ کی ۔ آج کو صاحب دیوان ہوتا ۔ اور جب ابتداء کا یہ رنگ ہے تو خدا جانے انتہا کیا ہوتی ۔ بہر حال گھر آئے ۔ اور ایک غزل نہایت صاف خط میں لکھی ہوئی ساتھ لائے ۔ ایسی نایاب غزل کا مشاعرہ میں نہ پڑھنا اپنے

اور ظلم کرنا ہے۔ غزل پر ظلم کرنا ہے اور سب سے زیادہ پبلک پر ظلم کرنا ہے۔ اسلئے دیکھتا رہا کہ کہاں اس طرح میں مشاعرہ ہوا اور کہاں میں یہ غزل پڑھوں۔ سچ ہے خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ طرح جامعہ عثمانیہ کے سالانہ جلسہ میں ہوئی اب کیا تھا۔ غزل سنبھالی اور مشاعرہ میں پہنچ گئے۔ بڑے شعراء غزل سے پہلے ایک آدھ رباعی یا قطعہ ضرور پڑھتے ہیں۔ آخر ہم ان سے کیوں ہیٹے رہتے۔ ایک رباعی بھی گھڑلی۔

اب رہا مشاعرہ میں غزل پڑھنا تو اس سے میں گھبرانے والی آسامی نہیں ہوں برسوں خود میرے گھر پر مشاعرہ ہوا ہے۔ اور میں نے ہر مشاعرہ میں غزل پڑھی ہے علیگڈھ میں حسرت موہانی نے مشاعرہ کیا ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شاعروں کو بلایا وہاں جاکر میں نے بڑے ٹھاٹھ سے دو غزلیں پڑھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ غزلیں میری نہیں تھیں۔ البتہ تبلیس شخصی ضرور کی تھی۔ یعنی دوسروں سے لکھوا کر خود اپنی بنالی تھیں۔ الغرض پوری طرح سے لیس ہو مشاعرہ میں پہنچ ہی گئے۔ جلسہ کے صدر عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت۔ جی۔ سی۔ ائی۔ ای۔ تھے۔ مجھ کو پہلے سے جانتے تھے میرے مضامین پسند فرماتے تھے۔ انہوں نے جو مجھے شاعروں کی صف میں دیکھا تو بڑا تعجب کیا جب میرے پڑھنے کا نمبر آیا تو ان سے بھی نہ رہا گیا۔ اور پوچھ ہی بیٹھے کہ "اوہو۔ آپ بھی شاعر ہیں"۔ میں نے عرض کی کہ "شاعر تو نہیں ہوں البتہ شاعر بننا شروع ہوگیا ہوں۔ چنانچہ اپنے حسب حال رباعی عرض کی ہے۔

احباب یہ کہتے ہیں جناب فرحت — اردو کا بس اب چھوڑئیے پیچھا حضرت
کچھ نثر ہی میں تیر بڑا مار اتھا — اب ہوگئے شاعر بھی خدا کی قدرت

اسکے بعد غزل پڑھی اور بڑے زور سے پڑھی۔ مہاراجہ بہادر نے بہت کچھ تعریف کی۔ یار لوگوں نے بہت کچھ واہ واہ کا غل مچایا۔ ہم نے سلاموں کی بہت کچھ بوچھاڑ کی اور غزل ختم کرکے گاؤتکیہ سے کمر لگا اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا پالا مار لیا۔ اسکے بعد غرور کا وہ چکر

دماغ میں رہا کہ کسی دوسرے پہلے آدمی کی غزل پرواہ۔ واہ کرنے کا خیال تک نہ آیا۔
مشاعرہ ختم ہوا۔ اور ہم اس طرح گھر واپس ہوئے جس طرح نپولین اٹلی کی فتح کے بعد پیرس
واپس آیا تھا۔ دوسرے دن سالانہ جلسہ ختم ہوا۔ صدارت کی اسپیچ میں مہاراجہ بہادر
نے مناسب الفاظ میں ہماری تعریف بھی کی۔ اور ایک قیمتی قلم اور پنسل کا سٹ انعام میں
دیا۔ چلو اچھے رہے۔ ایک ہی غزل میں خاصا رقمی فائدہ ہو گیا۔ ورنہ مضامین لکھنے
میں تو کوئی کوڑی نہیں دیتا تھا۔ ہاں پرچوں کا ایک ڈھیر کا ڈھیر ہر مہینہ آجاتا۔ مگر اس سے
کچھ حاصل۔ پرچہ پڑھا اور ردی ہو گیا۔ اب بھی کئی الماریاں اسی ردی سے بھری پڑی
ہیں۔ جگہ الگ رُک گئی ہے اور چوہوں کا الگ زور ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ
اس زمانہ میں ہندوستانی چوہے سب سے زیادہ خطرناک چیز ہیں۔

مجھ سے اگر پوچھو تو اس قلم اور پنسل نے مجھے شاعر بننے پر مجبور کیا۔ انسان حرص کا
بندہ ہے۔ خیال ہوا کہ آج پنسل ملی ہے کل شاید ہاتھی ملجائے اسلئے غزلوں کا سلسلہ
بندہ گیا۔ خیر ہاتھی تو نہیں ملا۔ مگر مہاراجہ بہادر کے ہاں سے بہت کچھ مل گیا۔

مشاعرہ سے واپس آنے کے بعد پلنگ پر لیٹ کر بڑی دیر تک جلسہ کا لطف اٹھاتا
رہا۔ اسکے بعد سوچا کہ بندۂ خدا یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ اس کی بسم اللہ غزل سے کیجاے۔
پہلے حمد لکھنی چاہئے۔ اس کے نعت لکھنی چاہئے۔ اور اسکے بعد اختیار ہے جو چاہو لکھو۔
بڑے بڑے شعرا کا حال دیکھو سب نے اپنے کلام کی ابتدا حمد و نعت ہی سے کی ہے۔ اور نہ
بھی کی ہو تو ان کے حالات لکھنے والے انہی کا کوئی شعر جو حمد و نعت میں ہوتا ہے لکھ کر
کہہ دیتے ہیں کہ اُستاد کی زبان پر سب سے پہلے یہ شعر آیا تھا۔ اس خیال نے تقویت
پکڑی۔ نیند اچاٹ ہو گئی۔ غرور کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اور اسی نشہ میں شعر اچھا کہا جاتا ہے
کیونکہ شاعر کو اپنی ذات پر بھروسہ ہوتا ہے۔ بہرحال حمد لکھ ہی دی۔ بھلا حمد کا انعام سوائے
خدا کے کون دیتا ہے۔ انعام دیا اور ایسا دیا کہ اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان

قاصر ہے۔ حمد ملاحظہ ہو۔

مجھ کو ذوقِ نظر دیا تو نے — بے ہنر کو ہنر دیا تو نے
باتوں باتوں میں کہکے قصۂ طور — سب کو مشتاق کر دیا تو نے
کیوں نہ اپنوں کو تو بھلاویگا — جبکہ غیروں کو بھر دیا تو نے
کر دیا دل کو سیر گاہِ خیال — بے گھروں کو بھی گھر دیا تو نے
جو کہا تو نے مجھ سے ہو نہ سکا — جو کہا میں نے کر دیا تو نے
مجھ سے خود سر غلام کو یارب — کون دیتا۔ مگر دیا تو نے

نعت شریف کی منزل بہت کٹھن ہے۔ یہاں ذرا سی لغزش قلم لکھنے والے کو دین دنیا دونوں سے کھو دیتی ہے۔ مگر خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ نعت لکھتے وقت خود بخود مجھ جیسے گنہگار انسان پر ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے اور بآسانی اس دشوار گزار راستہ سے گزار دیتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ یہ کیوں پیش آتا ہے اس کو میں خود نہیں جانتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب کبھی میں نعت شریف لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بلا ارادہ میرا قلم چلنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ تو یہ نوبت آئی ہے کہ میں ایک شعر لکھنے نہیں پاتا تھا کہ دوسرا شعر زبان سے نکل جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ میری یہ تحریر شاعرانہ تعلی یا دروغ گوئی سمجھی جائے۔ مگر "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" پر میرا ایمان ہے اور میں اس واقعہ کے بیان کرنے میں تل برابر بھی تعلی کرنے جرات نہیں کر سکتا۔ نعتِ شریف عرض ہے۔

ہر دو عالم کی ابتدا تو ہے — اور مشیت کا منتہیٰ تو ہے
سایہ کا سایہ کس طرح ہوتا — سایۂ رحمتِ خدا تو ہے
ہے سہارا تیرا امیروں کو — اور غریبوں کا آسرا تو ہے
ذات تیری ہے برزخ کبریٰ — خلق و خالق میں واسطا تو ہے

پردہ داری ہے مانعِ اظہار — ہاں مری دل سے پوچھ کیا تو ہے
ہے ہر ایک قوم کے لئے رہبر — اور ان سب کا رہنما تو ہے
کیوں بھروسہ نہ ہم کو ہو تجھ پر — معنیٔ وعدہ و وفا تو ہے
تیری تعریف مختصر یہ ہے — بعد اللہ کے بڑا تو ہے

اس کے بعد تو سمجھ لیجئے کہ شاعری اوڑھنا بچھونا ہو گئی۔ "کاتا اور لے دوڑی" کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ میاں فرحت شاعری تو کرتے ہو مگر عروض نہیں جانتے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی۔ اور مشاعرہ میں ٹوک دئے گئے تو کرکری ہو جائیگی۔ یہ خیال آتا تھا کہ عروض کی کتابیں دیکھنے کا شوق ہوا۔ بی۔ اے میں جب پڑھتے تھے اس وقت بھی کچھ بحریں یاد کرلی تھیں۔ مگر اسی حد تک کہ کورس کی غزلوں پر انکو چپکا سکیں یہ سمجھے ہی نہ تھے کہ علم عروض بھی ایک بحر بے پایاں ہے۔ اب جو اس مضمون کی کتابیں دیکھیں تو آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل بیزار ہو گیا کہ کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔ لیکن ایک طرف تو جی نہیں چاہتا تھا کہ شاعری چھوڑی جائے۔ دوسری طرف بغیر عروض سے واقف ہوئے شعر کہنا خالی از خطرہ نہیں تھا۔ اسلئے بہت کچھ سوچنے کے بعد ایک راستہ نکال ہی لیا۔ علم عروض میں اگر کوئی کتاب قابل قدر اردو میں لکھی گئی ہے تو وہ قدر بلگرامی کی کتاب "قواعد العروض" ہے۔ اس کتاب کو بڑے غور سے پڑھا۔ اور صرف ان بحروں کو لکھ کر حفظ کر لیا جو اردو شاعری میں اکثر و بیشتر استعمال ہوتی ہیں۔ اور اس طرح ہم کو بھی کچھ نہ کچھ "مکھی پہ مکھی مارنا" آگیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ میاں دانی دوبارہ ولایت گئے ہوئے تھے۔ وہ میرے مضامین کے بہت مداح تھے۔ اسلئے اپنی شاعری سے ان کو مرعوب کرنا مجھ پر لازم تھا۔ ایک غزل لکھ کر ان کو بھی بھیجدی۔ اور مقطع میں ان پر چوٹ بھی کردی۔ جواب میں انہوں نے ایک بڑا لمبا چوڑا خط تعریف میں لکھا۔ مقطع دیکھ کر غصہ تو ضرور آیا ہوگا مگر چپ ہو گئے۔ اور چپ

؎ یہ شعر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کا ترجمہ ہے۔

کیوں نہ ہوتے۔ ڈر گئے ہوں گے کہ یہ شخص شاعر ہو گیا ہے۔ اب کے غزل بھیجی ہے آئندہ کہیں ہجو لکھ کر نہ بھیجدے۔ غزل یہ تھی۔

بیدلی ہے مایۂ صد عیش سامانی مجھے ۔۔۔ داغ حسرت ہو گیا مہر سلیمانی مجھے
کیا پشیماں ہو کے نکلا تھا میں اسکی بزم سے ۔۔۔ لیگئی پھر کھینچ کر میری پشیمانی مجھے
جب حریم خاص تیرا جلوہ گاہِ عام ہو ۔۔۔ کیوں کشاکش میں نہ ڈالے تیری ارزانی مجھے
دوستو! فصلِ بہاری میں نہ دو تکلیف باغ ۔۔۔ باعث دلبستگی ہے گھر کی ویرانی مجھے
کیوں نہ ہو دل بے اعتبار خلق میں جب وہ حریف ۔۔۔ زخم ظاہر غیر کو دے۔ رنج پنہانی مجھے

میری رندانہ روش کو بہر اصلاح خیال
محتسب سے کم نہیں فرحتؔ میرا دانی مجھے

یہ غزل کا دوسرا رنگ تھا۔ مگر رنگ کی کیا پوچھتے ہو۔ یہاں خدا کے فضل سے کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔ جس رنگ میں چاہا لکھدیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا ابتک کوئی رنگ قایم ہوا ہے اور نہ کسی رنگ میں پختگی آئی ہے اور نہ انشاء اللہ آئیگی۔ بقول غالبؔ مرحوم۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میرؔ کے رنگ میں لکھتا ہوں۔ غالبؔ کے رنگ میں لکھتا ہوں۔ حالیؔ کے رنگ میں لکھتا ہوں۔ شبلیؔ کے رنگ میں لکھتا ہوں۔ غزل لکھتا ہوں۔ قومی نظمیں لکھتا ہوں مثنوی لکھتا ہوں۔ مخمس لکھتا ہوں۔ مسدس لکھتا ہوں۔ بہر حال شاعری کی کوئی صنف نہیں جس پر قلم نہ چلاتا ہوں۔ اس سے غرض نہیں کہ اس کامیابی ہوئی یا نہیں۔ شعر کہا یا منہ چڑایا۔ میر صاحب کے رنگ میں عرض کیا ہے۔

جھوٹ اسکا شعار ہے ابتک ۔۔۔ اور مجھے اعتبار ہے ابتک
شبِ ہجراں گذر گئی لیکن ۔۔۔ دل میرا بیقرار ہے ابتک

اپنے بیمارِ غم کو دیکھ تو آ — کہتے ہیں ہوشیار ہے اب تک
سر میرا اس نے گو اتار لیا — سر پہ احساں کا بار ہے اب تک
ہے خزاں۔ اور دل کے زخموں سے — میرے گھر میں بہار ہے اب تک
موت آ چک۔ کہ غیر کے غم میں — دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک
اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں — اور مجھے انتظار ہے اب تک

کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا
جس کا فرحت خمار ہے اب تک

غالب کا رنگ ملاحظہ ہو۔

دل مرا روزِ ازل سے بیقرارِ نغمہ ہے — ہر نفس اسکے لئے آوازِ تارِ نغمہ ہے
ہے مصیبت کیا، گذشتہ راحتوں کی یاد ہے — تو بھی دیکھو تو گویا یادگارِ نغمہ ہے
ساز کی حاجت نہیں ہے نغمۂ جانسوز کو — گوشِ اہلِ ذوق کو ہر سازِ عار نغمہ ہے
گوش برآواز بلبل ہیں تو سب گلہائے باغ — شاید انکو اس فضا میں اعتبارِ نغمہ ہے
جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے ساز سرود — درد کا اسمیں جو پردہ ہے شرارِ نغمہ ہے
یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوئبار — تان جو اس میں ہے گویا آبشارِ نغمہ ہے
ابر ہے ساقی ہے اور زمانہ سازگار — چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہارِ نغمہ ہے
انقلابِ دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دور — کیوں دلِ راحت طلب کو انتظارِ نغمہ ہے

میں کہاں فرحت کہاں اس طرزِ غالب میں
یہ مگر روزِ ازل کا ہی خمارِ نغمہ ہے

قومی نظموں میں حالی اور شبلی کا رنگ لیا ہے۔ حالی مرحوم کا رنگ ذرا مشکل ہے۔ نظم لکھے دیتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ رنگ آیا "بے رنگی" رہ گئی۔ یا حالی کے رنگ میں اقبال کا رنگ بھی ٹھنس گیا۔

پیدا کیا تھا مسلم کیا اس لئے خدا نے — در چھوڑ کر تو اس کا ڈھونڈے نئے ٹھکانے
اسلام کی حمیت کیا اس لئے ملی تھی — پڑ کر مصیبتوں میں آنسو لگے بہانے
تجھ کو ہی تو ملا تھا خیر الامم کا تمغا — تجھ پر ہی تو کھلے تھے غیب کے خزانے
تجھ سے ہی تو مٹا تھا سب کفر و شرک عالم — تجھ سے ہی تو سنے تھے توحید کے ترانے
تجھ سے ہی تو بہے تھے علم و ہنر کے دریا — تجھ سے ہی تو چلے تھے دنیا کے کارخانے
دنیا میں تو نے بیشک چھوڑے ہیں کارنامے — لیکن وہ کارنامے اب ہو گئے فسانے
کم ہمتی نے تیری تجھ کو تباہ کیا ہے — اور مٹ گئے ہیں آخر تیری بہت گھرانے
سُستی کو ہائے ظالم تو کہتا ہے توکل — اللہ سے بھی گویا کرتا ہے تو بہانے
تیرا دماغ اب بھی غیروں سے کم نہیں ہے — ہاں یونہی چاہتا ہے تو کام سب چلانے
مانا کہ تجھ میں اب بھی تھوڑی بہت سکت ہے — لیکن یہ رفتہ رفتہ لگ جائیگی ٹھکانے
نرغے میں ہیں ہے تیرا۔ اتنا ذرا سمجھ لے — اور پڑ رہے ہیں اسپر اغیار کے نشانے
ابتک ہے جوش تجھ میں یہ ہم بھی مانتے ہیں — پر اٹھ کھڑا ہو ہمت ذرا دکھانے

فرحت کو تھا جو کہنا۔ لے۔ کہہ چکا وہ تجھ سے
اب آگے کام تیرا تو مانے یا نہ مانے

غزلی کا رنگ ذرا اچھا آیا ہے۔ ہاں اس نظم میں یہ ضرور کیا ہے کہ مقطع کو مطلع اور مطلع کو مقطع اس لئے کر دیا ہے کہ ہماری قوم کا نظام بالکل الٹ چکا ہے۔ ذرا سنئے۔ عرض کیا ہے۔

سناؤں کیا تمہیں فرحت میں قصۂ ماضی — یہ وہ فسانہ ہے اڑ جائیں جسکو سنکر ہوش
کبھی زمین کی گردش ہماری ہاتھ میں تھی — کبھی فلک تھا ہمارا غلام حلقہ بگوش
کبھی ہمیں میں علیؓ سے تھے کاملان نبرد — کبھی ہمیں میں عمرؓ سے تھے صاحبان ہوش
کبھی ہمیں نے بچھائی تھی یہاں بساط طرب — کبھی ہماری ہی مے سے زمانہ تھا مدہوش

کبھی ہمیں نے بہائے تھے علم کے دریا — کبھی ہماری صلا تھی کہ "ہاں۔ بیا و بنوش"
کبھی تھی وقف ہمارے لئے شراب طہور — کبھی ہمارے لئے ہی تھا حور کا آغوش
اور اب جو دیکھو تو نقشہ بدل گیا سارا — نہ علم ہے نہ عمل ہے نہ جوش ہے نہ خروش
جو اہل علم محافظ ہمارے دین کے تھے — وہ آج سارے کے سارے ہوئے ہیں دین فروش
اگر دکھائیں کچھ ہمت تو جہل کہلائے — اگر زبان ہلائیں تو سب کہیں خاموش
ذرا سا خون بھی دیکھیں تو سر میں چکر آئے — کبھی جو دیکھ لیں تلوار ڈر کے ہوں بیہوش
نہ بزم میں ہے ہمیں راہ اور نہ رزم میں ہے — ہوں دام کھوٹے تو پھر کیا پرکھنے والے پہ دوش

ہماری جوش یہ کہتی ہیں اب تو مسٹر گھوش
گدائی گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اپنی شاعری کے دوسرے رنگوں کے نمونے میں آگے چل کر دونگا۔ کیونکہ اگر سب کے سب ایک جگہ لکھدے جائیں تو یہ تحریر مضمون کے بجائے دیوان ہو جائے۔ اور جس طرح دیوان پڑھتے پڑھتے لوگ اکتا جاتے ہیں اسی طرح آپ بھی اس مضمون کو اٹھا کر پھینک دیں۔ اور میں یہ نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس تحریر سے مرا مقصد یہ بتانا ہے کہ میں رفتہ رفتہ شاعر کیونکر بنا۔ اور آپ اگر شاعر بننا چاہتے ہیں تو کس طرح بن سکتے ہیں۔ بہر حال اسی شاعری کی بدولت مرا آنا جانا مہاراجہ بہادر کے ہاں بہت ہو گیا۔ اور بعض بڑی شعراء سے بھی ملاقات ہو گئی۔ دو نے مجھے شاعر مانا۔ اور دو نے بالکل انکار کر دیا۔ ماننے والوں میں تو مولوی علی حیدر طباطبائی (حیدر یار جنگ بہادر) مرحوم اور جلیل حسن صاحب (فصاحت جنگ بہادر) جلیل تھے۔ اور نہ ماننے والوں میں اصغر یار جنگ بہادر اصغر اور اکبر یار جنگ بہادر تھے۔ اصغر یار جنگ بہادر تو رفتہ رفتہ ایمان لے آئے مگر اکبر یار جنگ بہادر اب تک فرنٹ ہیں۔ یہ خود شاعر نہیں مگر سخن سنج بہت اچھے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ شاعروں کی بہ نسبت سخن سنجوں کو دبانا ذرا مشکل کام ہے۔ کیونکہ یہ شعر کہتے ہی نہیں جو شعراء کی اعتراضوں

سے ڈریں۔ خود اعتراض کرتے ہیں۔ اور اعتراض کرتے کرتے آخر کو منجھ گئے ہیں۔ اس اللہ کے بندہ نے صرف میری ایک غزل کے چند شعروں اور ایک نظم کی تعریف کی ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔ نظم سلسلہ کے لحاظ سے آئندہ لکھونگا۔

ہوں شت خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں — دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو ایک جہاں ہوں
کس طرح قافلہ کے ہمراہ چل سکوں میں — جو اٹھ کے بیٹھ جائے وہ گرد کارواں ہوں
جس کی تلاش میں ہیں ساری جہاں کے رہرو — اس بے نشاں کا میں ہی شاید ایک نشاں ہوں
آزادی حقیقی ملتی ہے کس کو بلبل — تو ہے قفس میں اور میں پابند آشیاں ہوں

مولانا طباطبائی کی صورت تو میں نے دیکھی تھی مگر ملنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ سررشتہ تعلیمات میری کتابیں خریدتے وقت ان کی رائے لیتا تھا۔ اور یہ ایسی رائے دیتے تھے جو واقعی میرے لئے مایۂ ناز ہے۔ اس طرح یہ میری تحریر سے واقف تھے۔ میری صورت سے واقف نہیں تھے۔ ایک دفعہ میں نظام کالج کے سالانہ مشاعرہ میں گیا۔ مولانا طباطبائی میر مشاعرہ تھے۔ پڑھنے والوں میں طلبار کے علاوہ شعرا بھی بہت سے تھے۔ مگر مولانا جو ایک نشست بیٹھے تو آخر تک پہلو نہ بدلا۔ واہ واہ کرنی تو کجا گردن تک نہ ہلائی بمعلوم ہوتا تھا کہ ان کو مشاعرہ سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ بعض شعرار کو برا بھی معلوم ہوا۔ گران کی عزت کچھ ایسی دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ زبان نہ ہلا سکے۔ آخر میں دو پڑھنے والے رہ گئے ایک میں اور ایک مولانا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میاں فرحت یہاں تو کچھ بھد ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ پڑھنے سے پہلے ذرا مولانا کو جگا لو۔ اسی لئے غزل سے پہلے میں نے یہ رباعی پڑھی اور پڑھنے سے پہلے مولانا کو متوجہ کیا کہ ذرا ملاحظہ ہو۔

بچپن تھا اسے تو عین راحت سمجھے — اور جوش جوانی کو قیامت سمجھے
پیری نے دکھائی آکے وہ کچھ نقشے — مرنے ہی کو ہم بہت غنیمت سمجھے

رباعی سنی۔ اور بہت نیچی آواز میں کہا۔ "ماشاءاللہ۔ اچھا رنگ ہے" اسکے بعد میں نے

طرحی غزل پڑھی۔ متوجہ رہے اور تعریف بھی کرتے رہے۔ غزل کچھ اچھی نہیں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ردیف بڑی بیہودہ تھی۔ پھر بھی تعریف بہت ہوئی اور اسلئے ہوئی کہ میر مشاعرہ اور وہ بھی مولانا طباطبائی تعریف کر رہے تھے۔ غزل ہے۔

اسی رہرو نے دریا کا رستا جانا — جسنے ہر خار کو منزل کا اشارا جانا
صحبت غیر نے جب تک ہی کھلنے نہ دیا — کیا میں سمجھا اسے اور اسنے مجھے کیا جانا
وہی افسردگی عالم امکاں سے بچا — رنج و راحت کو یہاں جنسِ تماشا جانا
میری بیتابی کا اندازہ اسی سے کرلے — غیر کو بھی شبِ فرقت میں مسیحا جانا
سجدے کر کے بتِ کافر کو یہ عادت بگڑی — ہے غضب کعبہ کو بھی میں نے کلیسا جانا

سب بُرا کہنے لگے کیوں تجھ کو آخر فرحت
کہ بروں کو بھی سدا تو نے تو اچھا جانا

اس کے بعد مولانا نے چند شعر پڑھے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی سب کھڑے ہو گئے۔ مولانا آہستہ آہستہ میری طرف آئے۔ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کہا "تو۔ آپ مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں" میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے کہ "اب تک ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا" میں نے کہا "جی ہاں"، میں ذرا ملتا جلتا کم ہوں" فرمایا "میرے ہاں کسی دن آؤ" میں نے کہا "بہت خوب" کہنے لگے "جمعہ کو چار بجے آنا میں انتظار کرونگا" میں نے کہا "بہت خوب" بس اس روز اتنی ہی باتیں ہوئیں۔ جمعہ کو چار بجے میں ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ وہاں جو پرانے قصے چھڑے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ وقت کدھر گزر گیا۔ مولانا مرحوم یوں تو بات بہت کم کرتے تھے۔ اور کرتے بھی تھے تو بہت نیچی آواز میں۔ مگر جب جوش آجاتا تھا تو پھر آواز بھی اونچی ہو جاتی تھی۔ اور زبان بھی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اور وہ وقت ہوتا تھا جب ان کے دل کی باتیں زبان پر آجاتی تھیں۔ اسکے بعد میں نے ہر مہینہ میں ایک دفعہ ان کے ہاں جانا اپنے اوپر لازم کر لیا لیکن

زمانہ نے فرصت نہیں دی۔ اور سال ڈیڑھ سال کے بعد ہی "مرنے ہی کو وہ بہت غنیمت سمجھے"۔ ان علمی صحبتوں میں جو لطف مجھے آیا ہے اس کو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ مٹیا برج کے واقعات وہ ایسی درد بھری آواز میں بیان کرتے تھے۔ کہ دل بیتاب ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ ان واقعات کو قلمبند کر لیجئے ورنہ آپ کے بعد پھر ان کا سنانے والا کوئی نہ رہے گا۔ فرمانے لگے "بھئی۔ اب مجھ میں دم نہیں ہے کہ کچھ لکھوں ہاں۔ نوٹ کرا دونگا۔ اپنے مشاعرہ کی طرح ان کو بھی ایک سلسلہ سے جما دینا" مگر اس وعدہ نے واقعہ کی شکل نہیں پکڑی تھی کہ وہ خود ختم ہو گئے۔ غالب مرحوم کے متعلق ان کے خیالات آج کل کے لوگوں کے خیالات سے مختلف تھے۔ وہ غالب کے کمال کے قائل تھے۔ مگر کہتے تھے کہ ان کے مضامین کی غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں جب مرزا صاحب غزل کے رنگ میں آجاتے ہیں۔ تو کمال کر جاتے ہیں۔ ان کی رائے تھی کہ غزل کے اصلی رنگ کو مومن خاں سے بہتر کسی نے نہیں نباہا ہے۔ اور ان کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن مومن خاں کے کمال کے سب قائل ہو جائیں گے۔ داغ مرحوم کے متعلق ان کا بہت اچھا خیال تھا۔ فرماتے تھے کہ داغ عالم نہیں مگر شاعر ہیں۔ اور امیر مینائی مرحوم شاعر نہیں مگر عالم ہیں۔ انہوں نے اکثر شعر داغ مرحوم کے مجھے سنائے اور کہا کہ میاں قافیہ اکثر شعراء اچھا باندھ جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کوئی ردیف کو چکائے تو ہم جانیں۔ ایک دفعہ استادی اور شاگردی کی بحث میں نے ان کے سامنے چھیڑ دی۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں اور ہمیشہ قائل رہوں گا۔ کہ ایک شخص کی تحریریں دوسرا شخص اصلاح نہیں دے سکتا۔ اگر دیگا تو لکھنے والے کے خیالات اور جذبات میں فرق آجائے گا۔ اور شاعری میں تو اصلاح کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ شاعر پر ایک کیفیت گزرتی ہے وہ اسی جوش میں ایک شعر کہتا ہے اور استاد ہیں کہ ٹھنڈے دل سے اس پر لکیر کھینچ دیتے ہیں۔ یہی بحث میں نے مولانا کے سامنے کی۔ فرمانے لگے۔ "اور جو الفاظ غلط ہوں یا شعر میں ٹھیک نہ جمے ہوں یا محاورہ

ٹھیک نہ بیٹھا ہو۔ تو "میں نے کہا کہ" شاعر کے لئے ضرور نہیں ہے کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے الفاظ یا محاورہ ہی کا استعمال کرے۔ وہ اپنے شہر کی زبان میں شعر کہتا ہے یہ ضرور نہیں ہے کہ اسپر دہلی یا لکھنؤ کی زبان کا رنگ چڑھایا جائے" بہرحال اکثر یہ بحث پیش آئی۔ مگر کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔ وہ اسلئے راضی نہیں ہوتے تھے کہ خود استادوں کی فہرست سے نکلنا پڑتا تھا۔ میں اسلئے راضی نہ ہوتا تھا کہ مجھے کسی کا شاگرد ہونا پڑتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کو میں نے اپنی تمام غزلیں سنائیں مگر کبھی انہوں نے یہ نہ کہا کہ یہ لفظ بدل دو۔ یا اس مصرعہ کو اس طرح کردو۔ انہی کی تحریک پر میں نے یہ غزل کہی تھی۔ اور انہوں نے اس کو بہت پسند کیا تھا۔

ہاں راز کھل نہ جائے اے پردہ دار ہستی
کچھ حد سے بڑھ چلا ہے اب تیرا جوش مستی

اس کا کرم ہے تیری افتادگی کا جویا
دریا کا رُخ ہمیشہ ہوتا ہے سوئے پستی

زاہد تو میکدے میں آجا۔ مگر بتادے
کیا تجھ سے نبھ سکیں گے آئین مے پرستی

اس عشق نے بھلادی سب بزم آفرینی
خاموش ہوگیا ہے گویا کہ ساز ہستی

شہرت طلب ہے شاید آہ و فغاں سے اپنے
یہ عاشقی نہیں ہے اے محوِ خود پرستی

کیا کیا نہ میرے دل میں ارماں بھرے ہوئے تھے
اور اب تو غم کے ہاتھوں ویران ہے یہ بستی

کم فرصتی سبب ہے دنیا میں کوششوں کا
ہے خوف مرگ ہی سے یہ سب بہار ہستی

فرحت تمہاری حالت کیوں دن بدن بگڑی
اتنی بلند نظری اور ایسی تنگدستی

اب رہے فصاحت جنگ بہادر جلیل تو وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ مسکین صورت ہی نہیں مسکین طبیعت بھی ہیں۔ ان کے ہاں جاؤ اور تعریفوں کی پوٹ باندھ کر لاؤ۔ دو ایک ہی صحبتوں میں وہ میرے خیالات سے واقف ہوگئے۔ اصلاح تو نہیں دیتے تھے مگر کبھی کبھی کہہ دیتے تھے کہ ذرا اس لفظ پر پھر غور کر لینا۔ مثلاً نعت شریف کا ایک شعر تھا۔

آج وہ دن ہے لرزتے ہیں سلاطین زمن　　زلزلہ ایوانہائے کسریٰ و قیصر میں ہے

فرمانے لگے اس میں "کسریٰ" دب گیا ہے"۔ میں نے کہا "کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کسریٰ ہمیشہ ہی دبتے رہے ہیں"۔ لیکن خدا لگتی بات تھی اسلئے خود ہی اس مصرعہ کو میں نے یوں بدلدیا۔ "زلزلہ ایوانِ کسریٰ قلعہ قیصر میں ہے" مگر میں اس اصلاح سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں۔ مصرعہ میں پہلے جو روانی اور جوش تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ "جو بندہ گیا سو موتی"۔ جلیل صاحب کا ایک حکم یہ ہے کہ جو کچھ لکھو وہ مجھے آکر سنا جایا کرو۔ یہی "حکم محکم" مہاراجہ بہادر کا ہے۔ اسلئے کرتا یہ ہوں کہ پہلے مہاراجہ بہادر کو نئی غزل یا نظم سناتا ہوں اور پھر جلیل صاحب کو۔ مگر ہے یہ کہ دونوں جگہ محنت کا صلہ مل جاتا ہے۔ اور شعر کہنے میں جو کوفت ہوتی ہے وہ یک قلم دور ہوجاتی ہے۔ حافظ جلیل صاحب کو میری چھوٹی بحر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔ ان کی رائے اگر لکھدوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ تعلی کر رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔ چھوٹی بحر کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جفا بھی تیری ایک ادا ہوگئی　　غرض ظلم کی انتہا ہوگئی

چلی تھی مری آہ کی جو سموم　　وہ تجھ تک پہنچ کر صبا ہوگئی

کبھی دل میں تھی آرزو وصل کی　　مگر رفتہ رفتہ فنا ہوگئی

اٹھائی تھی اُسنے جو غیروں پہ تیغ　　وہی میرے حق میں قضا ہوگئی

نظر نے جگر کو تو زخمی کیا　　مگر دردِ دل کی دوا ہوگئی

مری بیتابی و آہ و فغاں سے　　شکایت ہے زمیں کو آسماں سے

نہیں جنت میں چلنے سے تو انکار　　وہاں لاؤنگا درد دل کہاں سے

خدا کے واسطے خاموش رہیئے　　نکل جاتا ہے اکثر کچھ زباں سے

مرے تو بہ بہت لڑ لڑ کے ٹوٹی
تیرے جامِ شرابِ ارغواں سے
قفس میں آخر دن ہم نے گزاری
کہ خود واقف نہیں اب آشیاں سے

میری تکلیف کا خیال نہ کر
تیری ہر بات مجھ کو بھاتی ہے
دل کی باتوں پر آتا ہے غصہ
اور پھر کچھ ہنسی بھی آتی ہے
دیکھنے اس کو جاتے ہیں فرحت
دیکھیں تقدیر کیا دکھاتی ہے

ہوتی بیمار پہ ہے بھاری رات
کٹتی آنکھوں میں ہی ہماری رات
ہے یقیں آج تو نہ گزرے گی
تیرے بیمار پر یہ ساری رات
دیکھئے کس طرح بسر ہوگی
رات اور وہ بھی پھر ہماری رات
جاگتے جاگتے سحر ہو گی
کیا ہماری ہی ہے تمہاری رات

یہ غزل حافظ صاحب نے بہت پسند فرمائی ۔

وقفِ رنج و غمِ بتاں ہے دل
دردِ الفت کی داستاں ہے دل
تجھ سے کیوں حالِ دل زباں سے کہیں
عرضِ مطلب کو خود زباں ہے دل
ہوں میں گردش اسکے ہاتھوں سے
میرے حق میں تو آسماں ہے دل
ایسی نیرنگیاں دکھاتا ہے
گویا چھوٹا سا ایک جہاں ہے دل
اسکے ناوک کی ہے جگر میں کھٹک
چارہ گر کہتا ہے یہاں ہے دل
ساتھ تھے پہلے عقل و ہوش و حواس
اب تو گم کردہ کارواں ہے دل
دور ہوں اس سے ۔ اور ۔ دور نہیں
میں وہیں ہوں ۔ میرا جہاں ہے دل
کیوں نہ مجھ کو عزیز ہو فرحت
غمِ الفت کا پاسباں ہے دل

"دردِ دل" کی ایک غزل خود حافظ صاحب کی ہے۔ اسی پر میں نے یہ غزل لکھی ہے۔ مقابلہ نہ مجھے منظور ہے اور نہ مقابلہ کی ہمت ہے۔

ہر نگاہِ ناز اس کی دوستوں — خود مرض ہے اور دوائے دردِ دل
عشق کا تو ذکر کیا۔ ہاں رشک سے — غیر بھی ہے مبتلائے دردِ دل
ایک کھٹک سی ہے ابھی تو۔ دیکھئے — بعد میں کیا رنگ لائے دردِ دل
دین و دنیا اسکے آگے ہیچ ہیں — جس کسی کو راس آئے دردِ دل
عاشقوں کی ہے یہی ایک آرزو — جان جائے اور نہ جائے دردِ دل
توڑ دے میکش کے آگے جام مے — ہو اگر سننا صدائے دردِ دل
ابتدا میں اسکے موت آئی نظر — آگے دیکھیں کیا دکھائے دردِ دل

حاصل ہے عشق کا فرحتؔ جسے
کہتے ہیں اپنے پرائے دردِ دل

غرض حافظ صاحب کے ہاں کی صحبتوں کا بڑا لمبا قصہ ہے کہاں تک لکھوں خدا کا شکر ہے کہ یہ صحبتیں اب تک جاری ہیں۔ حیدرآباد جاتا ہوں تو ایک دو دفعہ حافظ صاحب سے ضرور ملتا ہوں۔ اور ایسا لطف اٹھا کر واپس آتا ہوں کہ دنوں باد رہتا ہے۔

اسی شعر شاعری کے سلسلہ میں ہندوستان کے ایک اور مشہور شاعر بے نظیر شاہ صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ یہ اکبر یار جنگ بہادر کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے۔ میں اس زمانہ میں مددگار معتمد عدالت تھا۔ اور نواب صاحب معتمد عدالت۔ اسلئے سرکاری کام پر اکثر ان کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ انہوں نے بے نظیر شاہ صاحب سے مجھے ملایا۔ لیکن وہ مجھ غریب کو خاطر میں نہ لائے۔ اور ایسے اکھڑے اکھڑے فقرے کہے کہ دل کھٹا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے سوا کسی کو شاعر سمجھتے ہی نہ تھے۔ میں تو بھلا کس گنتی میں تھا۔ وہ اساتذہ کے اشعار سنکر تعریف میں صرف "اوہنہ" کہدینا

کافی سمجھتے تھے ۔ البتہ اپنے اشعار سنانے سے کبھی نہ تھکتے تھے ۔ ان کے شاعر ہونے میں کلام نہیں ۔ مگر ان کی تعلی شاعرانہ تعلی سے بھی بہت کچھ بڑھی ہوئی تھی ۔ پہلی صحبت میں میں نے صرف ایک قطعہ پڑھا ۔ وہ یہ تھا ۔

کہا زاہد نے جا کر میکشوں سے — ملو تم فرحت عزلت گزیں سے
برستا نور ہے چہرہ پہ اس کے — ٹپکتا زہد ہے اسکی جبیں سے
کہاں ہوتے ہیں ایسے فرد پیدا — فرشتہ آگیا عرش بریں سے
ہنسے سب رند اور یوں ہنسکر بولے — گیا ہے اُٹھ کے وہ ظالم یہیں سے

انہوں نے اپنی ایک غزل اسی صحبت میں پڑھی ۔ مجھ کو بہت پسند آئی اور میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی ۔ دوسرے روز اسی طرح میں غزل لکھ کر لے گیا ۔ سنی اور بہت خوش ہوئے ۔ غزل یہ تھی ۔

میرے دل کی کلی کھلی ہی نہیں — زندگی میری ۔ زندگی ہی نہیں
اپنی آنکھیں تو دیکھو آئینہ میں — ہاں یہ سچ ہے کہ تم نے پی ہی نہیں
یوں پیا سے لیکے جام ساقی سے — جیسے توبہ تو میں نے کی ہی نہیں

قطعہ

ایک دو دن تو پی لے اے زاہد — خیر سے مے کی یہاں کمی ہی نہیں
دیکھیں پھر کس طرح یہ چھٹتی ہے — تیرے مُنہ کو ابھی لگی ہی نہیں
کیا وہ سمجھے شکستہ پائی کو — جسے ٹھوکر کبھی لگی ہی نہیں
دل کے لگنے ہی کچھ میری تقدیر — ایسی بگڑی کہ پھر بنی ہی نہیں
مدتوں سے ہوائے عیش و نشاط — غمکدہ میں میرے چلی ہی نہیں
خم الٹ کر یہ اسنے مجھ سے کہا — تیری قسمت میں دیکھ تھی ہی نہیں

آدمیت نہ جس میں ہو فرحت
سچ تو یہ ہے وہ آدمی ہی نہیں

خدا جانے یہ میرے مقطع کا مضمون تھا یا کیا بات تھی کہ اس کے بعد سے ان کا رنگ ہی بدل گیا۔ اور وہ اس طرح مجھ سے ملنے لگے جس طرح پرانے زمانہ کے بزرگ اپنے چھوٹوں سے ملتے ہیں۔ ایک دفعہ جو میں ان کے پاس گیا۔ تو کہنے لگے "ذرا بیٹھ۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے" میں بیٹھ گیا اور انہوں نے اپنا سامان ٹٹولنا شروع کیا۔ کہیں سے ایک کاغذ نکالا۔ کہیں سے دو ورق نکالے۔ کہیں سے بیاض نکالی۔ کہیں سے کتاب نکالی۔ اور تھوڑی میں ایک دفتر جمع کر لیا۔ سب کو کولی میں بھر میرے پاس لائے اور کہا "لے۔ یہ میری ساری عمر کی کمائی ہے۔ اس کو سلیقہ سے جما دے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اس ذخیرہ کو چھپوا دوں۔ اب یہ کام تیرے ذمہ ہے" بھلا میں اس مصیبت کو کب مول لینے والا تھا۔ میں نے کہا "حضرت معاف کیجئے۔ مجھے اپنے ہی کاموں سے فرصت نہیں۔ آپ کے دیوان کی ترتیب دینا میرے بس کی بات نہیں ہے" یہ سنکر وہ کسیقدر آزردہ ہو گئے۔ اور پھر ان کاغذوں کو لیجا کر صندوق میں ٹھونس دیا۔ اس کے بعد میں چلا آیا۔ پھر ایک دفعہ ہی خیال آیا کہ یہ ذخیرہ حاصل تو کر لو۔ یہ حضرت ایسے بیفکرے ہیں کہ اس کو کھو نہ بیٹھیں۔ یہ سوچ کر ایک دن اکبر یار جنگ بہادر کے ہاں گیا جس کمرہ میں بینظیر شاہ صاحب ٹھیرے ہوئے تھے وہاں جا کر دیکھتا ہوں تو کمرہ خالی پڑا ہے۔ نوکروں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب مر گئے۔ مر گئے اور ایسی جلدی! اکبر یار جنگ بہادر سے پوچھا انہوں نے واقعہ بتایا کہ اپریشن ہوا تھا۔ اسی میں خاتمہ ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے بفضلہ زندہ سلامت ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اچھی جگہ نوکر ہیں۔ شاہ صاحب کی شاعری کا کل ذخیرہ ان کے پاس ہے۔ عالیجناب نواب لطف الدولہ بہادر اس کی طبع کے اخراجات دینے پر آمادہ ہیں۔ میں ترتیب میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔ کئی دفعہ ان سے

کہہ بھی چکا ہوں۔ مگر یہ حضرت ہمیشہ "ہاں۔ ہاں"، تو کرتے ہیں لیکن عملاً کوئی کام نہیں کرتے۔ دیکھیے اب مرحوم کی عمر بھر کی کمائی رہتی بھی ہے یا ضائع ہو جاتی ہے اچھا میاں تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اس وقت اگر کچھ کر لیا تو تمہارا اور تمہارے مرحوم باپ کا نام رہ جائیگا۔ ورنہ تھوڑے دنوں میں کوئی جانیگا بھی نہیں کہ بینظیر شاہ صاحب شاعر تھے اور بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ نواب لطف الدولہ بہادر کی قدردانی قابل داد ہے کہ صرف ایک دفعہ شاہ صاحب سے ملے تھے۔ اور اب ان کے دیوان چھپوانے کو تیار ہیں۔ یہ تو خیر ان کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں۔ ہاں اس بات کی جسقدر تعریف کیجائے وہ کم ہے کہ شاہ صاحب کے مرنے تک نواب صاحب کے بھائی ان کے بستر مرگ کے پاس رہے۔ اور مرنے کے بعد نواب صاحب کی خاندانی ہڑواڑ میں ان کو دفن کیا گیا مرناسب کو ہے۔ مگر یہی باتیں کچھ یادگار رہ جاتی ہیں۔ ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ دفن کرنا تو کجا غیروں کے مردے ہڑواڑ میں سے نکالکر پھینکدے جاتے ہیں۔

اب صرف مہاراجہ بہادر کے مشاعروں کا ذکر کرنا رہ گیا ہے اور بس۔ سچ پوچھو تو انہی مشاعروں کی وجہ سے مجھے شاعر بننا پڑا ہے۔ اگر حکم دیتے تو قیامت تک میں ان کے کسی مشاعرہ میں نہ جاتا۔ لیکن اسکو کیا کروں کہ ان کی عنایت اور محبت نے مجبور کر دیا۔ ان کا محبت بھری آواز میں یہ کہنا کہ "دیکھو ضرور آنا" انکار کا بالکلیہ سد باب کر دیتا تھا۔ ہر مہینہ "مشاعرہ خاص" ہوتا اور ہر مہینہ ایک غزل کہنی پڑتی۔ میرا تبادلہ گلبرگہ شریف ہو گیا۔ اس وقت اس سلسلہ نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔ تاکید تھی کہ جب حیدرآباد آؤ۔ تو مجھ سے ضرور ملو۔ اور ملو تو کوئی غزل یا نظم ضرور سناؤ۔ معتمدی عدالت میں ذرا فرصت تھی۔ یہاں گلبرگہ شریف کی سشن ججی میں کام کی وہ بھرمار ہے کہ دم لینے کی فرصت نہیں اسلئے کرتا یہ ہوں کہ بجائے ریل کے موٹر میں حیدرآباد جاتا ہوں۔ ۱۳۰ میل لمبا راستہ ہے

راستہ بھر میں ایک غزل کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ دوسرے ہی دن مہاراجہ بہادر کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔ مزاج پرسی کے بعد ہی پہلا فقرہ ہوتا ہے "کیوں۔ کچھ لائے" غزل جیب سے نکالتا ہوں۔ پڑھتا ہوں۔ ان کی عنایت سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور چلا آتا ہوں۔ راستہ میں وہ غزل حافظ صاحب (فصاحت جنگ بہادر) کو بھی سنا آتا ہوں۔ اس کے بعد میری شاعری حیدرآباد کے دوسرے چکر تک ختم ہو جاتی ہے! ان سب غزلوں کا ایک طومار ہو گیا ہے۔ ان کا یہاں نقل کرنا گویا سارا دیوان چھاپ دینا ہے۔ اسلئے آخر میں ان کے کچھ اشعار لکھدونگا۔ انہی مشاعروں میں میں نے دو رنگ اور اختیار کئے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر مشاعرہ کے لئے دو طرحی مصرعے دے جاتے تھے۔ ایک اردو کا مصرعہ اور دوسرا فارسی کا۔ حیدرآباد میں فارسی میں کہنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ خیال آیا کہ میاں فرحت تمہارے باپ دادا کی زبان فارسی تھی۔ تم نے بھی تھوڑی بہت فارسی پڑھی ہے۔ آخر تم فارسی میں غزل کیوں نہیں کہتے یہ خیال آنا تھا کہ پہلے ہی مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی۔

موسم گل فصل بہاراں رسید — کار من و چرخ بساماں رسید
فصل بہار آمد و ما بے خبر — چشم کشادیم و زمستان رسید
فتنۂ چنگیز ز دل محو کرد — جور و جفائیکہ ز خوباں رسید
بر دل من داغ کہ ظلمش نہاد — بود گلے ترکہ بداماں رسید
عشق تو با صد سر و ساماں غم — بر سرایں بے سر و ساماں رسید
یافتہ ام بار دراں بزم ناز — مور بدر بار سلیمان رسید
شد ز خیالش کمر چرخ خم — بار امانت کہ بانساں رسید
یک نگہش داد مرا عمر خضر — جرعۂ از چشمۂ حیواں رسید
دامنم از دست جنوں چاک شد — مژدہ! کہ نوبت بگریباں رسید

آمدہ فرحت بہ شبستانِ شاد

بلبل خوش خواں بگلستان رسید

اس اپج نے یہ مصیبت ڈالی کہ ہر مشاعرہ میں بجائے ایک غزل کے دو غزلیں پڑھنی پڑیں۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک مصیبت میں نے اپنے سر مول لی۔ ہوتا یہ تھا کہ سب سے آخر میں عابد حسین صاحب بیگم اپنی ریختی پڑھتے تھے۔ ان کا کیا کہنا۔ ریختی کہنے میں۔ استاد ہیں۔ تمام عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ عورتوں کے محاوروں پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ لیکن خیالات عورتوں کے نہیں ہیں۔ اور اس بارے میں وہ بھی مجبور ہیں۔ انکی ریختی نے لکھنؤ میں نشو و نما پائی ہے۔ اور مجھ سے پوچھو تو لکھنؤ کی ریختی دراصل ریختی ہی نہیں ہے۔ اس کے موجد میاں رنگیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ریختی کے دیوان کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ جدت میں نے اسلئے اختیار کی کہ عورتوں کے محاورے اور ان کے خیالات محفوظ ہو جائیں۔ سید انشا نے اس ریختی کا وہ ہڑا کھویا کہ خدا کی پناہ اور لکھنؤ والوں نے اس کی وہ درگت بنائی کہ توبہ ہی بھلی۔ غرض کیا تھی۔ اور نتیجہ کیا نکلا۔ شعرائے ان غریب عورتوں کی زبان سے وہ وہ باتیں کہلوائیں کہ شیطان سنے تو پناہ مانگے۔ وہ وہ الفاظ کہلوائے کہ ان کو دہرانے میں شریف عورتیں تو کیا بیسوائیں بھی شرمائیں ایسے ایسے خیالات کا اظہار کرایا کہ ان کا دل میں گزرنا بھی انکی حیا و شرم پر بار ہے۔ غرض ریختی کیا کہی ہے بقول[1] غفرغتی "ظالم سانڈے کا تیل کھینچا ہے" اور مردوں کی محفل میں ان پردہ میں بیٹھنے والیوں کو ننگا کر دیا ہے۔ یہی خیالات تھے کہ میں نے بھی ریختی کہنے کی دل میں ٹھان لی۔ تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ریختی کس طرح لکھی جاتی ہے اور کیوں لکھی جاتی ہے۔ میں دوسرے ہی مشاعرہ میں مصرع طرح پر ریختی کہہ کر لے گیا۔ اردو اور فارسی کی غزلوں کی بعد بیگم نے اپنی ریختی پڑھی۔ اس کے بعد میں اٹھ کر شمع کے سامنے جا بیٹھا۔

[1] ملاحظہ ہو سید انشا کی دریائے لطافت۔

سب کو تعجب ہوا کہ اب یہ حضرت کس غرض سے آئے ہیں۔ مہاراجہ بہادر نے بھی فرمایا کہ "ہیں۔ یہ کیا" میں نے عرض کیا کہ "میں بھی ریختی پڑھوں گا" یہ سنکر سب کو تعجب ہونا ہی تھا اور ہوا بھی۔ اسکے بعد میں نے پہلے ریختی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور غزل پڑھی۔

کیا ہی غضب دیکھو بوا ہو گیا — سامنا آج ان کا میرا ہو گیا
چھوڑتی میں اور بھلا انکا ساتھ — تھا یہی قسمت میں بدا ہو گیا
ہوکہ یکیوں اٹھتی ہے دلمیں میرے — کیا وہ کہیں مجھ سے خفا ہو گیا
خیر سے اللہ انہیں لائے یہاں — ہولوں سے یہ حال میرا ہو گیا
تجھ کو تو خانم ہے بس ایک ہی لالک — دور نگوڑی تجھے کیا ہو گیا

کیا ہی مچائی ہوا فرحت نے دھوم
نون جو سالن میں ذرا ہو گیا

اس غزل کی اتنی تعریف ہوئی کہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ مہاراجہ بہادر کے یہ الفاظ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے کہ "آج ہمیں معلوم ہوا کہ ریختی کس کو کہتے ہیں"۔ بیگم نے بھی بہت تعریف کی۔ میں نے معذرت کی۔ انہوں نے بھی اپنی غزلوں کو یہ رنگ دینا چاہا۔ مگر پچاس ساٹھ برس کا پرانا رنگ ذرا مشکل ہی سے اترتا ہے۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعروں میں ریختی کا بھی ایک دم چمپا میرے ساتھ لگ گیا۔ خواجہ حسن نظامی تو میری ریختی پر ایسے لوٹ ہیں کہ جب ملتے ہیں تعریف کرتے ہیں۔ اور جس سے مجھے ملاتے ہیں میری ریختی کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ میرا نیا رنگ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ جن شعراء کو خدا نے ریختی کہنے کا مادہ عطا کیا ہے وہ بھی اسی رنگ میں ریختی کہنا شروع کریں۔ اسلئے

لہ اس شعر کو دیکھئے کہ کسقدر زبردست چوٹ ہے۔ بہت کچھ کہدیا ہے مگر ایک لفظ خلاف تہذیب نہیں آیا ہے۔ لالک خانم "تو" کا لفظ ہے اور اسکے معنی "شوق" کے ہیں۔ دوسرے مصرعہ نے ظاہر کردیا ہے کہ یہ شوق کوئی بہت بڑا شوق ہے"

میں چند غزلیں یہاں لکھتا ہوں۔ اور کہیں کہیں نوٹ بھی دیتا جاتا ہوں تاکہ عورتوں کے خیالات کا اظہار ہو جائے اور یہ معلوم ہو کہ ان کے کن جذبات پر نظر رکھ کر یہ شعر کہا گیا ہے۔

عورتوں کی فطرت ہے کہ ہمیشہ دوسروں پر پردہ ہی پردہ میں چوٹ کرتی ہیں۔ مگر ایسے چبھتے ہوئے الفاظ میں کرتی ہیں کہ تیر و نشتر کا کام کر جائیں۔ لیکن بعض دفعہ اس ڈر سے کہ کہیں جھگڑا نہ بڑھ جائے اسپر مرہم بھی لگا دیتی ہیں۔ اس غزل کا پہلا شعر عورتوں کی اسی عادت کو ظاہر کرتا ہے۔

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے — پر۔ بوا کیا سلیقہ والی ہے
شیخ جی تم نے اور کے پیچھے — اپنی صورت یہ کیا بنالی ہے

"برتو کل زانوے اشتر ببند" کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

دین ہے اسکی آج دے کل دے — میں نے دائی مگر بلالی ہے
جا رہی ہوں ہوا کے گھوڑے پر — ڈولی والا مرا خیالی ہے

دہلی میں اکثر کہاروں کا نام "خیالی" ہوتا ہے۔ اس خیال کے ساتھ اس شعر کا خیال کیجئے۔

نوج بیٹھوں میں چڑھ کے کرسی پر — میں نے پیڑھی بوا بنالی ہے

یہ پرانی بڑھیوں کا خیال ہے۔ وہ اپنی پرانی عادتوں کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتیں کرسی بیٹھنا ان کی وضعداری کے خلاف ہے "بنالی" کا لفظ صرف عورتیں ہی بولتی ہیں۔

منہ لگو تم نہ سوت کے مرزا — جانے بھی دو موئی رذالی ہے

میاں کو سوکن سے خفا دیکھ کر کیا دل کا بخار نکالا ہے۔

کیوں لگیں دن نئی نصیبن کو — آج کل گھر میں کو توالی ہے
کیا کسی کو بنا رہیگی دولت — وہ موئی آنے جانیوالی ہے

"آنے جانے والی" خاص عورتوں کا محاورہ ہے۔ اور فاحشہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

پات پات آپ ہیں اگر فرحت

تو یہ بندی بھی ڈالی ڈالی ہے

بس چل چکی امیرن تیری یہ گھر گرستی　　تجھ پر موئی ابھی سے چھائی ہوئی ہے مستی
ہمسائی نے مجھی بھی سمجھا ہے کچھ ندیدہ　　جو چیز بھیجتی ہے مجھکو۔ بوا۔ ترستی

"ترستی چیز" خاص عورتوں کا محاورہ ہے۔ اسکے معنی ہیں بہت تھوڑی چیز جسکو کھاکر نیت بھی نہ بھرے۔

پلے نہیں ہے کوڑی اور سیر کی ہے سوجھی　　کس کام کی ہے خانم ایسی بھی فاقہ مستی
اس مردوے کی خاطر کیا کچھ کیا نہ میں نے　　چولھے میں گھس کے توبہ۔ میں! ورنہ جلتی

میاں سے لڑکر اپنی کارگزاری کا اظہار ہے۔

مسجد میں اب اذاں بھی دیتا نہیں ہے کوئی　　جمن مرا ہے جب سے سنسان ہے یہ بستی

اکبر مرحوم نے کہا ہے "کونسل میں بہت سید۔ مسجد میں فقط جمن"، لیجئے وہ جمن بھی مر گیا۔ اور مسجد کیا ساری بستی سنسان ہو گئی۔

کیا سارے گھر سے نیکی صابن اجڑ گیا تھا　　ہاتھوں میں میرے تو نے جو رکھ دی ہے بلستی

رستہ میں دن دہاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا
مینے بھی غل مچاکر سر پر اٹھائی بستی

یہ دیکھا آپ نے۔ باہر نکلنے والیاں بھی معمولی چھیڑ خانی کی برداشت نہیں کرسکتیں۔ اب جو غزل لکھ رہا ہوں یہ خواجہ حسن نظامی صاحب کو بہت پسند آئی ہے۔ کئی دفعہ سن چکے ہیں۔ مولانا طباطبائی بھی اس مشاعرہ میں شریک تھے جس میں یہ غزل مینے پڑھی تھی۔ ایک غزل کیا ۳ غزلیں پڑھی تھیں۔

بھلا عاشق کوئی کیا ہوگا ہمسائی کی صورت کا　　بوا یے چادری سی ہے بھرم بی بی کی عصمت کا

دوسرا مصرعہ "عصمت بی بی از بے چادری" کا ترجمہ ہے اور یہی محاورہ عورتوں کی زبان پر ہے۔

لڑاکا میں سہی۔ اچھا۔ پھوہڑ بھی میں سہی۔ مانا
مگر یہ بھی تو دیکھو حال کیا ہے خود بدولت کا

تھکی کہہ کہہ کے میں ان سے کہ چھوڑو اپنی یہ باتیں
نہیں جاتا بوا جب پڑ گیا چسکا بُری لت کا

پکاؤں میں سیوں میں۔ سارے گھر بھر کو سمیٹوں میں
مجھے راحت نہیں ملتا ہے کوئی آدمی گت کا

بہن میں کیا کروں اب ہاتھ میں پیسہ نہیں ٹکتا
تمہیں تو یاد ہو گا پہلے جو تھا حال برکت کا

تمہاری ایک ہی لونڈے سے ناک میں دم تھا
اور اب تو دوسرا نکلا ہی خانم بس قیامت کا

گھسی جس گھر میں اس گھر میں لڑائی ڈالدی اسنے
نگوڑے سیہ کا کانٹا ہی کالا منہ ہو دولت کا

کتر کر تو نے میری سارے کرتے ادھیڑ کر ڈالے
سلیقہ اب تلک آیا نہ بنو تجھ کو بیوت کا

تو خود ہے چاندسی تیری میاں بھی اچھے خاصے ہیں
ہوا ہے اے بوا آخر یہ لونڈا کس کی صورت کا

ملاحظہ ہو کیا زبردست چوٹ ہے۔ اور کس صفائی سے ہاتھ مارا ہے۔

بی ہمسائی بھی ایلو کیا تماشہ بن کے آئی ہیں
ذرا ان دیکھو انکا۔ اور یہ جوڑا اتّی لاگت کا

ہم اپنی جان چھڑکیں اور مردوں کو نہیں پروا دیں
بہن سچ ہے زمانہ اب نہیں رکھ رکھاوٹ کا

بوا یہ ریختی نکلی ہے انکے ہی گھرانے سے
سنا ہو گا میاں رنگین[1] سے جو رشتہ ہے فرحت کا

میں اسی سلسلہ میں اس مشاعرہ کی دوسری غزلیں بھی لکھدیتا ہوں تاکہ میری شاعری کے مختلف رنگ ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں۔

پھنکا جاتا ہے سوزِ غم سے دل بیمارِ الفت کا
الٰہی۔ ہاں۔ ادھر بھی ایک چھینٹا اپنی رحمت کا

ذرا دل کھول اور نظارہ کر تو اسکی قدرت کا
یہی تو قفل ہے ظالم درِ گنجِ حقیقت کا

بہت کڑیاں اٹھائی ہیں بہت آگے اٹھائینگی
مگر کچھ تو ٹھکانہ بھی ہو آخر اس مصیبت کا

ہجومِ یاس میں بھی کچھ نہ کچھ امید رہتی ہے
جھلکتا غم میں بھی ہے اک نہ اک پہلو مسرت کا

میرے دلکو قرار ایک دم نہیں آتا نہیں آتا
مگر سایہ پڑا ہے اسپہ بھی تیری طبیعت کا

نہ اپنے دل سے تو ہرگز مٹا داغِ محبت کو
کہ یہ پروانہ ٹھہری ہے اور پھر وہ بھی جنت کا

[1] سعادت یار خاں رنگین میری دادی کے سگے چچا تھے۔

ی کو بھی یقیں آسکتا ہے تو ہی بتا ہمدم — وہ اسکی بھولی صورت اور یہ غصہ قیامت کا
ے رسوا کیا - مارا - جلایا - خاک کر ڈالا — ادا ایک ایک حق اسنے کیا میری محبت کا
ال ہی بند نبضیں چھٹ چلیں آنکھیں پھر ہیں میری — تیرے قربان کیا موقعہ نکالا ہی عیادت کا

غزل سنکر مزا آجاتا ہے دلی کی اردو کا
خدا اچھا رکھے - واللہ کیا کہنا ہی فرحت کا

اب مزاحیہ رنگ ملاحظہ ہو -

اب شیخ ٹھیکہ لیچکے جب ساری جنت کا — برہمن کو صلہ ملتا ہی کیا دیکھیں عبادت کا
زعصر کا وقفہ ہوا ہے وعظ میں زاہد — چلو پی آئیں - ایسے میں - کہ ہی یہ وقت فرصت کا
ٹلی کی خدمت کا ہی دعوی موسولینی کو — جناب شیخ کو بھی فخر ہے جورو کی خدمت کا
ی جوراسے صاحب کو بلایا تھا کمشنر نے — وہ یوں رکھی ہے چٹھی گویا پروانہ ہی جنت کا
ڑ ہوگئے لکھ پڑھ کے قسمت سے خلیفہ جی — مگر ڈھب یاد ہی ابتک بھی لوگونکی حجامت کا
لیڈر ہی بن کر جیل میں تھوڑی بہت کاٹیں — کہ اب بے وارثوں پر بند ہی دروازہ خدمت کا

ابھی ڈاڑہی منڈی ہے، ایکدن مونچھیں بھی غائب ہیں
غرض ہونے لگا ہی اب اثر فرحت یہ صحبت کا

میرے گلبرگہ شریف آنے کے چند ہی روز بعد میلاد مبارک کا ایک پبلک جلسہ قلعہ کی ہی مسجد میں ہوا - سب کا اصرار تھا کہ اس موقعہ پر کچھ ضرور پڑھو - میں نے نعت شریف ہی اور وعدہ کرلیا کہ ہر سالانہ جلسہ میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ کر سعادت دارین حاصل کرونگا - نعت شریف یہ ہے اور اسمیں التزام رکھا گیا ہے کہ ہر شعر میں میلاد مبارک کے متعلق روایت آجائے - نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے اس کو بہت پسند فرمایا ہے ان کا خیال ہی کہ ایسا التزام ابتک ان کے دیکھنے میں کبھی نہیں آیا -

وہ دن کہ القا مع پیغمبر میں ہے — آج وہ دن ہی کہ شان طور اس منبر میں ہے

آج وہ دن ہے کہ ظاہر ہوتے ہیں ختم الرسل | مرحبا صل علیٰ کا شور بحر و بر میں ہے
آج وہ دن ہے لرزتے ہیں سلاطین زمن | زلزلہ ایوان کسریٰ قلعہ قیصر میں ہے
آج[1] وہ دن ہے جھکی پڑتی ہے رحمت کی گھٹا | بعد مدت آج پھر آسودگی ہر گھر میں ہے
آج وہ دن ہے چھپا پھرتا ہے شیطان لعین | اک ہزیمت کا سا نقشہ اسکی کل لشکر میں ہے
آج وہ دن ہے کہ اوندھے گر پڑے لات و ہبل | آج سے نقصان ہی نقصان صنعت آذر میں ہے
آج وہ دن ہے چلی کعبہ سے جنت کی نسیم | بس گیا سارا زمین و آسماں عنبر میں ہے
آج وہ دن ہے فرشتوں کا زمیں پر ہے ہجوم | خدمت روح الامیں آج آمنہ کے گھر میں ہے
آج وہ دن ہے کہ ٹھنڈے پڑ گئے آتشکدے | فرط حیرت سے سر پیر مغاں چکر میں ہے
آج وہ دن ہے کہ سب در ہائے دوزخ بند ہیں | کافروں کو آج راحت شعلہ و اخگر میں ہے
آج وہ دن ہے کہ سب در ہائے جنت کھل گئے | غلغلہ عیش و طرب کا گنبد بے در میں ہے
آج[2] وہ دن ہے کہ ساوہ خشک بالکل ہو گیا | انقلاب اک آنے والا یعنی بحر و بر میں ہے
آج وہ دن ہے جھکے پڑتے ہیں گردوں سے نجوم | جذب شوق دید شہ مہر و مہ و اختر میں ہے
آج وہ دن ہے کہ تھا جسکا جہاں کو انتظار | جشن[3] میلاد مبارک آج ہر اک گھر میں ہے

آج وہ دن ہے کہ فرحت محو شوق دید ہے
جسم اس محفل میں ہے جاں گنبد خضریٰ میں ہے

خدا کا شکر ہے کہ ۳ سال سے میں اس وعدہ کو پورا کر رہا ہوں۔ البتہ گزشتہ سال کام کی زیادتی کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ جلسہ کا دن آگیا۔ شام کو جلسہ میں جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ کہ خود بخود ایک مطلع دل سے نکل کر زبان پر آگیا۔ اسی وقت کاغذ لا۔ لکھ لیا

[1] یہ اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ عرب میں قحط تھا۔ میلاد مبارک کے دن مینہ برسا اور قریش کی بدحالی دور ہوئی [2] ساوہ کے خشک ہونے کی وجہ قابل غور ہے۔ یہ مضمون بالکل نیا ہے۔

[3] یہ مصرع طرح ہے۔

ابھی پوری طرح لکھنے نہ پایا تھا کہ دوسرا شعر ہوگیا۔ اور پھر تو اس طرح سلسلہ بند ہا کہ لکھنے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ غرض دس بارہ ہی منٹ میں نعت شریف پوری ہوگئی۔ اور جلسہ میں مجھے معذرت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ مجھ سے پوچھو تو یہ نعت شریف میری محنت کا نتیجہ نہیں ہے کہیں اور کا عطیہ ہے۔ اس پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔

وہی آغاز ہے وہی انجام — بعد اس کے ہے بس خدا کا نام
کون وہ؟ جو ہے جزو نورِ خدا — کون وہ؟ جو ہے منبع اسلام
کون وہ؟ جسکو اپنے فقر پہ فخر — کون وہ؟ جسکے بادشاہ ہیں غلام
یعنی وہ فخر انبیاے سلف — یعنی وہ۔ حق کا آخری پیغام
شافع المذنبیں ہے جسکا لقب — رحمت العالمیں ہے جسکا نام
جسپہ زیبندہ تاج فخر رسل — جسپہ زیبا قبائے خیر انام
ڈرتے تھے جس سے قیصر و کسریٰ — گرتے تھے جسکے نام سے اصنام
جسکا پابند حکم۔ دور فلک — جس کے قبضہ میں گردش ایام
جسنے پرواہ نہ کی امارت کی — جسنے غربت میں کردی عمر تمام
جس کی توصیف میں زباں قاصر — جسکی تعریف میں خدا کا کلام
جس پہ پڑھتے ملائکہ ہیں درود — جسپہ آتا رہا خدا کا سلام
رنگ دنیا بدل دیا جس نے — رکھا تقوی پہ جسنے دین کا نظام
نرم دل جسکا موم کی مانند — عزم جسکا مثال سنگ رخام
ہیں مساوی جسے امیر و غریب — وقف سب ہے جس کی رحمت عام
جسنے ظلموں پہ کان تک نہ دھرا — کام سے اپنے جسنے رکھا کام
غمزدوں کی جسے ہمیشہ تلاش — بیکسوں کا جسے خیال مدام
ظلم کو جس نے کر دیا نابود — جسنے پہنچایا رحم کا پیغام

جس نے پھیلا دیا اخوت کو — فرق قومی کا جس نے توڑا دم
فخر نسلی مٹا دیا جس نے — ایک جیسے کئے خواص و عام
جو ہے دنیا کا ملجا و ماوٰے — جو ہے آخر امید گاہ انام
شرک کی جس نے آکے جڑ کاٹی — جس نے توحید کا پلایا جام
جس کے اقوال سب من اللہی — جس کے احکام سب خدا کا کلام
جس کو دن رات فکر امت تھی — جسنے دم بھر لیا نہ کچھ آرام
جس کا ہر فعل قابل تقلید — جس کا ہر قول دافع اوہام
جس نے بد کو دبایا نیکی سے — جسکو بدلہ کا خیال تک تھا حرام
ڈھانک دی جسنے سب پہ چادر عفو — نہ لیا جس نے انتقام کا نام
زلف جس کی حریف مشک ختن — رُخ پر نور جس کا ماہ تمام
استراحت کو فرش جس کا زمیں — پاؤں رکھنے کو عرش جس کا مقام
جسکا ہر وقت۔ وقف ذکر و صلواۃ — جس کا ہر روز مثل روز صیام
ایسے ہادی پہ صد ہزار درود — ایسے مرسل پہ صد ہزار سلام

حال فرحت پہ ایک نظر آقا
قابل رحم ہے یہ تیرا غلام

گلبرگہ شریف آنے کے بعد یہ سمجھو کہ غزل گوئی کا تو تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ کالج کے مشاعروں میں دو چار غزلیں کہیں یا جب کبھی حیدرآباد جانا ہوا تو مہاراجہ بہادر کو سنانے کے لئے راستہ میں کچھ غزلیں لکھ لیں۔ ان چلتی ہوئی غزلوں میں یہ غزل مجھے بہت پسند آئی ہے ممکن ہے کہ آپ بھی پسند کریں۔ عرض کیا ہے۔

تیرے دل میں کیا بدگماں آگیا — کہ چکر میں سارا جہاں آگیا
اُٹھانے نہ پائے تھے لطف بہار — کہ اتنے میں دور خزاں آگیا

تیرے ظلم میں آرہے تھے مزے ‏ ‏ یہ کیوں بیچ میں آسماں آگیا
مرے سر کو بھی درسی تیری یہ ربط ‏ ‏ جہاں سر جھکا آستاں آگیا
ہوئے خاک جل بھن کے قلب و جگر ‏ ‏ مگر لطف آہ و فغاں آگیا
نکالے تو جاتے بھی ہم بزم سے ‏ ‏ مگر شکر ہے پاسباں آگیا
اُبلنے لگی جام میں خود شراب ‏ ‏ جہاں ذکر دردی کشاں آگیا

یہ اکعبہ ہے فرحت نہیں بتکدہ
بھٹک کر کہاں سے کہاں آگیا

بہرحال یہاں آکر میرے طبیعت نے رنگ بدلا۔ اور غزلوں کی بجائے نظمیں لکھنے کا شوق ہوا۔ اسی زمانہ میں شہزادہ والاشان اعظم جاہ بہادر اور شاہزادی دُر دانہ بیگم صاحبہ (درشاہوار) اپنے چشم و چراغ دودمان آصفی یعنی نواب مکرم جاہ بہادر کو لیکر نیس سے زیارت کے لئے یہاں تشریف لائے۔ اسٹیشن پر بڑی دھوم سے خیر مقدم ہوا۔ ایک بڑا شامیانہ سجایا گیا۔ رعایا کی یہ حالت تھی کہ شہزادہ کو دیکھنے کے لئے ٹوٹی پڑتی تھی۔ اسپیشل ٹرین آکر شامیانہ کے سامنے رکی۔ ولیعہد بہادر اترے۔ سب لوگ آداب بجالائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فرانسیسی آیا۔ شاہزادہ کو گود میں لیکر سیلون میں سے نکلی ہر شخص کی آنکھیں بس اُدھر ہی گئیں۔ شاہزادہ کو شامیانہ میں لائے۔ مینے ولیعہد بہادر سے اجازت لیکر یہ قصیدہ پڑھا۔

ازفیض قدوم تو اے رحمت یزدانی ‏ ‏ شد پاک دل عالم از گرد پریشانی
ہرچند نمی زیبد دعوی سخندانی ‏ ‏ بیخود بہ زباں آمد ایں مصرعہ لاثانی

از نیس ہمی آید نو بادہ عثمانی

بر روے خواہاں شد واد رمیخانہ ‏ ‏ آراستہ شد محفل ہر سمت ملوکانہ
شد جلوہ فگن ساقی با شیشہ و پیمانہ ‏ ‏ ہر رند بوجد آمد زیں نغمۂ مستانہ

ازیں پس ہمی آید نوبادۂ عثمانی

ایں گلبن نورستہ از گلشن عثمان ست　　نور نظر آصف لخت دل سلطانست
اسم است مکرم جاہ ہم برکت علی خانست　　از مقدم میمونش گلبرگہ گلستانست

ازیں پس ہمی آید نوبادۂ عثمانی

اے نور دل اعظم۔ ای دلبر دردانہ　　در سایۂ عثمان زی باشوکت شاہانہ
تو شمع دل افروزی ملک است چو پروانہ　　دلشاد ازیں ہر کس چہ خویش چہ بیگانہ

ازیں پس ہمی آید نوبادۂ عثمانی

فرحت زغم عالم دارد دل شکستہ　　در گوشۂ افتادہ افسردہ و پربستہ
در شوق لقائے تو از کنج قفس جستہ　　خواند بولائے تو ایں مصرعہ برجستہ

ازیں پس ہمی آید نوبادۂ عثمانی

اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ ارادہ تھا کہ میں بھی اسی نمونہ پر کوئی چیز لکھوں یہ تو ہمت نہیں پڑی کہ اللہ میاں سے شکایت کے دفتر کھولوں اور جواب کا طالب ہوں۔ اس لئے ایسا مضمون اختیار کیا جو اللہ کے فضل سے ہر گھر میں روزانہ پیش آتا ہے یعنی میاں بیوی کا جھگڑا۔ سررشتہ تعلیمات کے سالانہ جلسہ میں اسکاوٹ کے دو لڑکوں نے میاں بیوی بن کر ڈرامے کے طریقہ پر اسکو پڑھا تھا۔ شروع میں میں نے کچھ نثر ہی لکھدی تھی تاکہ سلسلہ قائم ہو جائے۔ وہ نثر تو اب یاد نہیں رہی نظم حاضر ہے۔

شکوہ

مری پیاری موٹی مری جان بیوی　　مری وضعدار اور پہلوان بیوی　　قسم ہے نہیں کچھ غلو اس میں حاشا　　خدا کی ہے قدرت کا تو ایک تماشا
میں کتنا سنبھالوں نہیں دل سنبھلتا　　تجھے دیکھ کر دم ہے میرا نکلتا　　اری تیری باتوں سے اوسان میرے　　بیٹھے جاتے ہیں چھو نسے ہیں کان میرے
نہ کھانا پکانا۔ نہ سینا پرونا　　ہمیشہ پڑے رہنا دن رات سونا　　ذرا کچھ کہا اور پھر پھیل لانا　　قیامت بپا کرنا ٹسوے بہانا

بڑی چاؤ سے بیاہ کر تجھ کو لایا مگر خوب ہی ناچ تو نے نچایا بہو کو بگاڑا جہاں پایا تو نے غرض کہ دیا گھر کا گھر ڈھا دیا تو نے
بی اماں سے دن رات کی دشمنی ہے اور ابا سے ہر دم لڑائی ٹھنی ہے یہ سسرے کی عزت نہ کچھ ساس کی ہے میرا بھی غرض ستیاناس کی ہے
عجب حال تیرا ہے اے گھر کی مالک ابھی ہے تو مجذوب ابھی ہے تو سالک کبھی چپکے رہنا کبھی شور کرنا کبھی مسکرانا کبھی آہ بھرنا
نہیں پڑتا غیروں سے گو کام تیرا سہم جاتی ہیں سنکر وہ نام تیرا ڈراتی ہے بچے کو یہ کہکے افضق ذرا ٹھیر تو - دیکھ وہ آئی موئی
نہ دیکھی خوشی تیرے باعث کسی نے محرم ہے اس گھر میں بارہ مہینے ہیں ماما ئیں نالاں تو نوکر پریشاں بپا رہتا ہے ہر طرف ایک طوفاں
تجھے بغض ہے مرے سب دوستوں سے خدا ہی بچائے انہیں کوسنوں سے اگر چھوکرا پان لانیکو جائے تو اندر سے وہ جوتیاں کھا کے آئے
سینما نہ جاؤں تو آخر کروں کیا یونہی کام ہے کہ ڈر کر تو مر دوں کیا کہاں تک بھلا ہوگا آخر نبھاؤ کہاں تک چلیگی تری لاؤ لاؤ
ہے پہلے ہی سے مجھ پہ قرضہ کی آفت مچا دی ہے پھر اس پہ تو نے قیامت دیوالہ کسی دن ہے میرا نکلتا مہینے کا جب خرچ نو دن ہے چلتا
میں چوری کروں یا کہیں ڈاکہ ڈالوں سنبھالوں تو اس گھر کو کیونکر سنبھالوں کبھی کام میں جو جاتا دنیا سے رخصت مگر ہر دفعہ روکدیتی ہیں فرحت
وہ کہتی ہیں بھائی یہ ہے رنگ دنیا تمہارے ہی گھر کا نہیں کچھ یہ نقشا پیمبر کی سنت ہے سب کے گلے میں اترتی نہیں ہے بھلے اور بری میں
ذرا صبر کو کام میں کچھ تو لاؤ نہ بیوی کو ہر وقت یوں کھائے جاؤ یہ مانا کہ بیوی ہے بیکار ہے وہ مگر کچھ نہ کچھ پھر بھی حقدار ہے وہ

غرض ہر طرف سے ہے مجھ پر ہی آفت
کہ تو ہے ادھر اور ادھر بھائی فرحت

اسکے جواب میں بیوی صاحبہ نے وہ وہ چٹکیاں لی ہیں کہ خدا کی پناہ ۔ ساس سسرے کی عادتوں پر حملہ کیا ہے ۔ میاں کے اخراجات کی زیادتی اور آمدنی کی کمی پر حملہ کیا ۔ اپنی بیکسی کا رونا رویا ہے ۔ اور آخر میں اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی دی ہے ۔ مگر ایک چیز خاص غور کے قابل ہے کہ اس کے الفاظ بہت مہذب ہیں ۔ ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا ہے جو میاں کے شکوہ کی طرح بیہودگی کی حد تک پہنچا ہو ۔ اب رہا طرز بیان تو وہ ایسا چبھتا ہوا ہے کہ میاں کو جل بھن کر چپ ہو جانا پڑا ۔ آخر کیا کرتے ۔ سچی باتیں تھیں کچھ سختی سے بے تکا جواب دیتے تو لڑائی ہو جاتی ۔ اور بیوی ڈولی میں بیٹھ میکے پہنچ جاتیں ۔

جوابِ شکوہ

مری اچھے شوہر۔ مری پیارے شوہر　　مری دہان پان اور بیچارے شوہر　　بہت صبر کی اب نہیں دل میں طاقت　　کہانتک اٹھائے کوئی یہ مصیبت

اچھے تمہیں یوں تو چھوٹے بڑے ہیں　　مگر مجھ نگوڑی میں کیڑے پڑے ہیں　　گھسے گھر میں اور ایک طوفان آیا　　نہیں دیکھتے پھر تم اپنا پرایا

نہ کیوں دل جلے کچھ نہیں تم سے بیٹی　　بڑی باپ کی میں بھی آخر موئی بیٹی　　ادہر تم جلاؤ ادہر ساس کوسیں　　اجی تو میں کیا اچھے اچھے ہی دیں

بری میں بھی اور برا میرا کنبہ　　تو پھر پیر پڑ کر کیا کیوں یہ رشتہ　　میاں جو وپلی میں ہیں تنخواہ پاتے　　اور اس سے وپلی میں ہیں انجم جاتے

اسی میں ہیں پھر دعوتیں اور چندا　　غرض لاؤ - لاؤ کا ہے تم کو دھندا　　کبھی ہے سینما کبھی ناچ گانا　　مری پاس گویا گڑا ہے خزانہ

ہیں ارمان جو دل میں میں سارے نکالو　　مجھے جاگی گدڑی پہ تم بیچ ڈالو　　ہو جب ایسے تم۔ ساس کو کیا کہوں میں　　یہی جی میں ہے کہا کہ کچھ سو رہوں میں

میری بات جب ساس سسرے نہ مانیں　　تو گھر آپ کا جانیں اور آپ جانیں　　میں لاوارثی اور بے گھر نہیں ہوں　　میں ماں باپ کی ایسی دو بھر نہیں ہوں

یہ کہتے ہو تم سچ کہ میں ہوں نکھوٹی　　تو پھر تم بتاؤ کون ہے رزدر روٹی　　یہاں تو ہمیشہ تمہاری ہی ٹھہری ہے　　کسی دن بھی اس گھر میں ماما جڑی ہے

بی اماں تو ماما کی خود جان کھائیں　　اور الزام سارا مرے سر لگائیں　　مری آنا یہاں آ گئی تھی بیچاری　　اسی دن اتنا کلکل سے وہ بھی سدھاری

یہ مانا نہیں میں نے اب تک سیا کچھ　　کبھی تم نے کپڑا ابھی لا کر دیا کچھ　　وہی میں نے پہنا جو میکے سے لائی　　رہا اب کفن وہ بھی لا دینگی بھائی

نہیں مجھ ہی پر کچھ اترتا ہے غصہ　　پریشان ہے تم سے سارا محلہ　　سلاتی ہے ہمسائی بچہ کو بھوکا　　یہ کہکر کہ سو۔ دیکھ وہ آیا سو کھا

نہیں کوئی۔ اور ضد یہ ہے کوئی آؤ　　ذرا پان اندر سے بنوا کے لاؤ　　ادہر چھوکرا آ کے ہے شور کرتا　　ادہر پاندان میں ہے ہو حق کا بھرتا

بھرا دیتی گھر بھر کو میں چاہے مانیں　　مگر بی حمیدہ صدا آڑے آئیں　　وہ کہتی ہیں دیکھو بہن یہ نہ کرنا　　تمہیں تو اسی گھر میں جینا ہے مرنا

یہ حکم پیمبر کہیں بھول جانا　　خدا کو ہے ایک دن تم سے منہ دکھانا　　ہو صبر کر صبر کا پھل ملیگا　　زمانہ کبھی تو جگہ سے ہلیگا

میں کس کشمکش میں ہوں آفت رسیدہ

ادہر آپ ہیں اور ادہر بی حمیدہ

آپ نے دیکھا کہ میاں کے دوست نے کیا نصیحت کی تھی اور بیوی کی سہیلی نے کیا نصیحت کی۔ دونوں نے مذہب کے احکام کو بیچ میں ڈالا ہے۔ دوست صاحب نے ان احکام کو مزاحیہ پہلو سے لیا ہے۔ اور بیچاری سہیلی نے ان کے اظہار میں اپنا ایمان

کی پختگی دکھائی ہو۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کے مذہب صرف عورتوں کی وجہ سے چل رہے ہیں۔

مجھے مزاحیہ مضامین لکھنے میں کچھ مزا آتا ہے۔ اور اسی لئے رفتہ رفتہ قلم سے خود بخود ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جو خوش مذاقی کا پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ ہجو کی جان ہے۔ اگر میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا کہ نہ تعزیرات ہند ہوتی اور نہ اسکی دفعہ ۵۰۱ تو یقین مانئے میں بھی ہجویں لکھ کر ایک پشتارہ چھوڑ جاتا اور خاصہ نام پیدا کرلیتا۔ اب بھی اپنے قلم کا زور آزمانے کے لئے چند ہجوئیں لکھی ہیں۔ اور واقعی بڑے لطف کی ہیں۔ مگر کیا کروں ان کو یہاں اسلئے نقل نہیں کرسکتا۔ کہ کہیں انجن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاوں۔

عثمان آباد کے دورہ نے میری شاعری میں ایک پہلو کا اور اضافہ کیا۔ ہے یہ کہ قدرتی نظاروں کا جو لطف گاؤں والے اٹھاتے ہیں وہ شہر والوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ہوا یہ کہ میں عثمان آباد کے ایک ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ یہ بنگلہ آبادی سے ذرا دور ایک کھلے میدان میں ہے۔ برآمدہ میں اسپرنگ پلنگ بچھا تھا رات کے کوئی ساڑھے چار بجے آنکھ کھل گئی۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ چاندنی مدہم ہونی شروع ہوئی۔ مشرق کی طرف اجالا ہوا۔ ستارے ایک ایک کرکے ڈوبنے لگے پرندوں نے درختوں پر چہچہانا شروع کیا۔ غرض ایسا دلچسپ سماں تھا کہ بیان نہیں ہوسکتا اس وقت اس نظارہ کو الفاظ میں ادا کرنے کو جی چاہا۔ دل ایسا بشاش تھا کہ نہ لفظوں کی تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی نہ مضمون سوچنے کی حاجت۔ یہ فقت میں ایک نظم ہوگئی یہ ضرور ہے کہ اس میں نہ شوکتِ الفاظی ہے اور نہ استعاروں اور تشبیہوں کا زور۔ ایک سیدھی سادی نظم ہے۔ مگر واقعات ایسے ہیں جو ہر صبح کو دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن کوئی شہر والا ان کے دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔

صبح

چلی سمت مشرق سے باد سحر   خوشی سے لگا جھومنے ہر شجر   سووں میں نئی تازگی لائی صبح   عجب دلربا شان سے آئی صبح
موذن نے دی مسجدوں میں اذاں   پرندوں نے کی حمد ورد زباں   لگے ٹمٹمانے گھروں کے چراغ   ہوا ہے معطر ہوا صحن باغ
ذرا الگ گئی آنکھ بیمار کی   کھلی آنکھ ہر ایک دیندار کی   بتوں کو سب اپنے جگانے لگے   برہمن سوئے دیر جانے لگے
جو دی مرغ نے پھڑپھڑا کر اذاں   گیا سونیوالوں کا خواب گراں   کہ گل بن گئی کھل کے ہر ایک کلی   صبا نے کچھ اس طرح کی گدگدی
تڑپتے تڑپتے یونہی سو گئے   جو جاگے ہوئے تھے شب ہجر کے   گئی آنکھ بھی انکی آخر جھپک   لگی تھی نہ جنکی پلک سے پلک
گھروں کو چلے منہ چھپاتے ہوئے   سیہ کار بچتے بچاتے ہوئے   برا ہی بہت نیند سے انکا حال   میسر جنہیں آ گیا تھا وصال
سیاہی شب سمت مغرب ڈھلی   ستاروں کی مدہم ہوئی روشنی   جو بیکار تھے جاگ کر سو گئے   ہوا سے شگفتہ جو دل ہو گئے
درختوں پہ ہونے لگی کائیں کائیں   نہ باقی رہی رات کی سائیں سائیں   سیاہی سپیدی سے کچھ دب گئی   ہوئی صبح اور ظلمت شب گئی
کنارے ہوئے ابر کے سنہری   سپیدی میں جب مل گئی روشنی   مکانوں میں ہونے لگی کچھ تمیز   دکھائی لگی دینے ہر ایک چیز
کہیں سو پچاس اور کہیں تین چار   چلے ڈھور ڈنگر سوئے کشت زار   دھواں کچھ گھروں سے نکلنے لگا   زمانہ کا پھر کام چلنے لگا
گڈریے ہوئے ساتھ کتا لئے   چراگاہ کی سمت ریوڑ چلے   جوا اپنی گردن پہ اٹکا لیا   کسانوں نے بھی ساتھ اٹکا دیا
ستاروں کی شبنم رخصت ہوئی   سپیدی میں چمکی کرن مہر کی   لگی باندھنے اوس رخت سفر   اٹھایا شگوفوں نے غفلت سے سر

بڑھی روشنی۔ دور اندھیرا ہوا
لو اٹھ بیٹھو فرحت سویرا ہوا

میں نے اس نظم کو بعد میں بڑھانے کی کوشش کی مگر اس صبح کا اثر دل سے زائل ہو چکا تھا آورد کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس لئے اس اضافہ کو قلمزد کر دیا۔ بات یہ ہے کہ جب انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسیوقت انسان کچھ لکھ سکتا ہے۔ ورنہ گھسیٹنے کو جو چاہو گھسیٹ پھینکو۔ اب رہی کیفیت تو اس کے پیدا ہونے کے لئے بعض دفعہ ایک معمولی سی بات کافی ہوتی ہے۔ بچے گراموفون بجا رہے تھے۔ علی حسین نابینا کا

گایا ہوا ریکارڈ "اشربوا - اشربوا - اشربوا - لگایا - میں باہر برآمدہ میں بیٹھا فیصلہ لکھ رہا تھا - اس ریکارڈ کا کچھ ایسا اثر دل پر ہوا کہ فیصلہ رکھ اسی پر مصرعے لگانے شروع کر دئے - اور چونکہ دلی جوش سے کام شروع کیا تھا اس لئے اسی وقت تکمیل بھی ہو گئی - ملاحظہ ہو -

میرے دل میں ہے بس اک یہی آرزو — سب بھرے میکدے کے ہوں جام و سبو
اور کہے مجھ سے وہ ساقی شعلہ رو — میں بھی دیکھوں بھلا کتنی پیتا ہے تو

اشربوا[1] - اشربوا - اشربوا - اشربوا

جھومتا پھر اٹھا ابر قبلہ نما — چھائی رندوں پہ اسکے کرم کی گھٹا
دیا ساقی نے کھلوا در میکدہ — ابتو رندوں میں ہے بس یہی گفتگو

اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا

آج ساقی کا لطف و کرم عام ہے — آج ہر رند کے ہاتھ میں جام ہے
آج پینے سے ہر ایک کو کام ہے — آج خالی سبھی کر دو جام و سبو

اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا -

ایک تو مے کا پینا نہیں دلگی — آگ ہے خلق کے نیچے جو نہی گئی
اور اس پر یہ ساقی کی طعنہ زنی — ایک ہی جام میں اس قدر ہا و ہو

اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا

ایک ہی جام جب حال ابتر کرے — اور ساقی صلائے کرر کرے
کس میں ہمت ہے جو یہ مہم سر کرے — خود ہی گھبرا کے کہتے ہیں مجھ سے عدد

اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا

ایسا دیکھا نہ ہوگا تماشہ کبھی — ہے قیامت جو رہ جائے تشنہ کوئی

[1] جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کو "اشربوا" کا آخری الف دھوکا دیگا - قواعد کے لحاظ سے عربی میں "اشربوا" لکھا جاتا ہے اور "اشربو" پڑھا جاتا ہے -

خم ساقی نے کردی ہے دریا دلی   دوش پر خم ہے اور یہ صدا کو بکو
اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا

کیا ہی گھر گھر کے پھر بادل آنے لگے   پاؤں توبہ کے پھر لڑکھڑانے لگے
رند بزم طرب پھر جمانے لگے   آج ہے باغ کی کچھ عجب رنگ و بو
اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا -

جانتا ہوں کہ اب تک نہیں تم نے پی   تم کو رندی سے نفرت ہمیشہ رہی
ایسا موقعہ نہ فرحت ملیگا کبھی   ابر ہے - مے ہے اور تم بھی ہو باوضو
اشربوا - اشربوا - اشربوا - اشربوا

اسی زمانہ میں گلبرگہ شریف میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا - طرح تھی "بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں" - ایک کارروائی کے ضمن میں طبیعت جلی ہوئی تھی - ہے یہ کہ میں "جی اور جینے دے" پر عمل کرنے والا انسان ہوں - کسی کو چھیڑتا نہیں - اگر کوئی چھیڑ نکالتا ہے تو طرح دیجاتا ہوں - مگر جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو غصہ آ ہی جاتا ہے - یہی صورت اس زمانہ میں پیش آئی تھی - دل کا بخار اس طرح نکال ہی لیا - رباعی کہی تھی -

ناقدری و نخوت سے ہے معمور جہاں   اس دور میں خودداری کا موقعہ ہے کہاں
کس کس کے میں آگے سر جھکاؤں فرحت   ہر بندہ کو دعویٰ ہے خدائی کا یہاں

اور غزل ہوئی تھی -

عیش میں شاد نہیں - رنج میں ناشاد نہیں   دل ہی وہ ہم کو ملا ہے جسے کچھ یاد نہیں
کر لو فریاد - مگر حاصل فریاد نہیں   اسکے جب ذہن میں ہی معنی بیداد نہیں
آشیاں میں بھی تو اب روح لرزتی ہے مری   گو سمجھتا ہوں کہ یہ خانہ صیاد نہیں

قطعہ

کچھ طبیعت سے ہوں لاچار جو خاموش ہوئیں
چرخ سمجھا ہے کہ اب طاقت فریاد نہیں

آہ و نالوں سے قیامت میں بپا کر دونگا
یا تو محشر میں نہیں یا چرخ کی بنیاد نہیں

پہلی باتوں کا وہ خود ذکر کیا کرتے تھے
اب کہو بھی تو وہ کہتے ہیں مجھے یاد نہیں

جو نہیں بند قفس میں وہ ہیں پابند معاش
سچ تو یہ ہے کہ یہاں ایک بھی آزاد نہیں

میری بربادی کے ہیں اور بھی لاکھوں ساماں
منحصر تجھ پہ ہی کچھ اے دل ناشاد نہیں

کچھ ہی مطلب ہو مگر ہوتی ہے تسکیں دل کو
جب وہ کہتے ہیں عدو لائق بیداد نہیں

کم نگاہی سے سمجھا میرا دل خوگر ظلم
اسپہ بیداد یہ کیا کم ہے کہ بیداد نہیں

کعبہ جاؤں بھی تو کیا جا کے کروں۔ اے زاہد
جب خود ی کا ہی یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

اپنی خود داری پہ ہے ناز مجھے اے فرحت
کہ پسا جاتا ہوں اور طالب امداد نہیں

ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ حیدرآباد جانے کو تیار تھا۔ سامنے موٹر کھڑی تھی۔ ایک دوست مجھ سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو کے سلسلہ میں انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ دیرینہ را" اسی وقت خیال آیا کہ اگر دنیا کے بعض واقعات بیان کر کے اس مصرعہ کو جوڑ دیا جاے تو ایک اچھی اور سبق آموز نظم ہو سکتی ہے۔ ان صاحب کو رخصت کیا۔ موٹر میں بیٹھا۔ اور اس مصرعہ کو دہرانا شروع کیا موضع اکبیلی پہنچتے پہنچتے دو ڈھائی گھنٹہ میں نظم پوری ہو گئی۔ عجب جناتی خط میں مسودا ہوا ہے۔ موٹر کے ساتھ قلم ملتا تھا اور لفظوں شکل عجیب و غریب ہو جاتی تھی۔ حیدرآباد پہنچ کر اسکو صاف کیا۔ یہ وہ نظم ہے جسکو میری شاعری کے منکر نواب اکبر یار جنگ بہادر نے بھی پسند کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پیر زال دہر کے دھوکے میں تو ہرگز نہ آ
جو خدا اسپر ہوا بے موت آخر مر گیا

چاہنے والوں کو اسنے جب دیا دھوکا دیا　　انقلاب دہر کی تاریخ تو پڑھ لے ذرا
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

بڑھتی ہیں جب حد سے اس دنیا میں نافرمانیاں　　کرتے ہیں ہر کام میں جب لوگ بے ایمانیاں
نوح کے طوفان کی سی آتی ہیں طغیانیاں　　ساری عالم میں جو پھیلا دیتی ہیں ویرانیاں
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

چھائے جب دل پر تری رنج و مصیبت کی گھٹا　　اور نہ ملتا ہو کوئی رستہ کشاد کار کا
واقعات حضرت یونس کو پڑھ لے تو ذرا　　بچ گیا وہ جسنے اسکی ذات پر تکیہ کیا
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اپنی طاقت سے زیادہ تو نہ ہرگز کام کر　　حد سے آگے گر بڑھیں روح الامیں جل جائیں پر
حد مقرر ہے ہر ایک کے واسطے اے پیمبر　　واقعات طور و موسیٰ پر ہمیشہ رکھ نظر
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

سربلندی کو سمجھتا ہے اگر تو لازوال　　یا تجھے کرتا شکستہ دل ہے پستی کا خیال
دیکھ چشم فکر سے دارا و اسکندر کا حال　　ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

غیب سے ملتی ہے بیشک نیک کاموں میں مدد　　قول پر میرے صحابہؓ کی خلافت ہے سند
کچھ نہ کچھ ہوتی ہے آخر کوشش انساں کی حد　　حال وہ تھا کام ایسے تھے کہ اللہ الصمد
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ہے شجاعت پر بھی کل اقوام عالم کا مدار　　ہے شہید اور غازیوں کا خون صد رشک بہار
رہتی دنیا تک رہے گا نام ان کا برقرار　　لافتیٰ الا علیٰ لاسیف الا ذوالفقار
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تجھ کو پژمردہ اگر کر دے حوادث کی ہوا　　کھول کر پڑھ لے کوئی خونیں ورق تاریخ کا

اس طرح ثابت قدم رہتے ہیں مردانِ خدا   تجھ پہ ثابت یہ کریں گے واقعاتِ کربلا
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

نام ہی کی شرم کر آخر تو کہلاتا ہے مرد   مشکلوں میں پڑکے تو بھرتا ہی ہردم آہ سرد
پست ہمت ڈر نہ جا پوری تو بن جا ذرا مرد نبرد   لے سبق بابر سے یہ جہاں کا رے نکرد
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

کیا ہی سچی ہے مثل اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے   ملتی ہے خدمت سے عظمت اس میں کوئی شک نہیں
دیکھ لے حالات عالمگیر و آصفجاہ کے   کر کے خدمت پاس کو نزدیک ہی آنے نہ دے
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

جو پھنسا اس جال میں وہ ایک دن برباد ہے   کاہلی سب آفتوں کی بیخ اور بنیاد ہے
حال نادر اور محمد شاہ تجھ کو یاد ہے   مرغ کاہل کیلئے ہی دام اور صیاد ہے
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

یاد رکھ تیری سمجھ میں آگیا ہے کچھ فتور   دولت و اقبال کا ہی گر ترے سر میں غرور
حال قیصر دیکھ لے اب اور کیوں جاتا ہے دور   تو گریگا ایک دن قعرِ مذلت میں ضرور
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

پھنس گئے جب دام میں خود۔ کیا گلہ صیاد کا   جب ہوئے عاشق تو کیا رونا دلِ ناشاد کا
چشم دل سے دیکھ قصہ شیرین و فرہاد کا   اب نہ موقع آہ کا ہے اور نہ ہے فریاد کا
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

ہر قدم پر ٹھوکریں ہیں چل ذرا تو دیکھ کر   رہروِ دنیا بہت دشوار ہے تیرا سفر

۱؎ اس مصرعہ پر بعض حضرات اعتراض کریں گے کہ اس میں "اور" کی بجائے صرف "و" عطف آنا چاہئے۔ مگر میں "اور" کو بھی صحیح سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میری رائے ہے کہ جب اضافت ہم نے اردو میں لیلی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کے بعد فارسی زبان اور اس کے قواعد کی پابندی کیجائے اور عطف کی صورت میں "و" لایا جائے اور لفظ "اور" نہ لایا جائے۔

صبحِ عیش و شامِ غم کو رکھ سدا پیشِ نظر	انقلابِ دہر را یا دیدۂ عبرت نگر

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

کچھ ہمیشہ سے ہنرمندوں پہ دنیا تنگ ہے	قدر دانی اور ہنر میں کچھ سدا سے جنگ ہے
ہر قدم پر ان کے فرحت خار ہے یا سنگ ہے	اب زیادہ کیا کہوں جب خود یہ میرا رنگ ہے

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مذہب کے احکام ہیں کہ دین و دنیا کو ملا کر چلاؤ - دنیاوی مضامین کے تو آپ بہت سے شعر سُن چکے - اب دینی مضمون کے بھی کچھ اشعار سن لیجئے - یہ نعت شریف میں نے گذشتہ سال کے جلسہ میلاد مبارک میں عرض کی تھی -

رحمتِ حق کی گھٹا دنیا پہ کیوں چھائی ہے آج	کیوں نئے سر سے ہوئی یہ عالم آرائی ہے آج
کیوں زمین و آسماں یکسر معطر ہو گئے	مشک میں بس کر نسیمِ خُلد کیوں آئی ہے آج
مست ہو کر کیوں چہکتی ہیں چمن میں عندلیب	کیوں گلوں کو دل میں آخر شوقِ رعنائی ہے آج
خوابِ غفلت سے اٹھایا کیوں ہے ہر غنچہ نے سر	کیوں چمن کا ہر جواں محوِ خود آرائی ہے آج
آ رہے ہیں اسطرح کیوں پے بہ پے روح الامیں	کیوں فرشتوں کی زمیں پر کار فرمائی ہے آج
کیوں پہاڑوں میں چھپا پھرتا ہے ابلیسِ لعیں	اور شیاطیں میں یہ گھبراہٹ سی کیوں چھائی ہے آج
قصرِ کسریٰ کے یہ سب کیوں ہل رہے ہیں کنگرے	کیوں کلی پیرِ مغاں کو دل کی مرجھائی ہے آج
آ رہی ہے ناز کرتی اور اٹھلاتی ہوئی	جانفزا مژدہ کوئی بادِ صبا لائی ہے آج
ہاں سمجھ میں آ گیا اے قاصدِ فرخندہ پے	کس کے آنے کی مسرت تو نے پھیلائی ہے آج
یعنی تکمیلِ نویدِ حضرتِ عیسیٰؑ ہوئی	اور مرادِ حضرتِ ابراہیمؑ بر آئی ہے آج
پردہ ہائے راز میں اب تک جو تھا نورِ خدا	آمنہؓ کے گھر میں اسکی جلوہ فرمائی ہے آج

جی میں آتا ہے کہ میں ایک مطلع رنگیں پڑھوں
سن کے یہ مژدہ طبیعت جوش پر آئی ہے آج

ایک سراپا ذاتِ حق اس دہر میں آئی ہے آج
باطل و حق کی کشاکش تصفیہ پائی ہے آج

مضطرب تھا ایک عالم جسکے شوقِ دید میں
اب کہیں آنے سے اسکے سب کو کل آئی ہے آج

کیوں نہ ہو امید سے لبریز ہر انساں کا دل
ناامیدی کی دلِ عالم سے پسپائی ہے آج

ہے ظہورِ پاک تیرا یا کہ اے خیر البشر
رحمتِ حق شکلِ انساں میں اتر آئی ہے آج

آج کا دن وہ مبارک دن ہے میری دوستو
جس کسی نے جو دعا مانگی ہے بر آئی ہے آج

آمد آمد ہے شہِ والا کی باغِ دہر میں
رحمتِ حق خیر مقدم کیلئے آئی ہے آج

ابرِ رحمت نے مٹائے نقش آثارِ خزاں
باغِ عالم میں نئے سر سے بہار آئی ہے آج

یوں تو جھکتے ہیں سدا اس در پہ سب بندوں کے سر
سچ اگر پوچھو تو کچھ لطفِ جبیں سائی ہے آج

تیرہ بختوں کو مبارک ہو کہ چرخِ پیر نے
ظلم سے پرہیز کرنے کی قسم کھائی ہے آج

ابرِ رحمت ہے مئے الفت ہے اور ساقی بھی ہے
مژدہ اے رندوں کہ لطفِ بادہ پیمائی ہے آج

آگیا وہ چارہ سازِ دردمندانِ جہاں
ختم جسکی ذات پر فرحت مسیحائی ہے آج

میں نے رسالہ چوپنچ اور سرپنچ کے لئے مزاحیہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اپنی طبیعت کے خلاف ان غزلوں کو وہی رنگ دینا پڑا جو ان رسالوں کا تھا۔ میری رائے میں خوش مذاقی کے مضامین سے کہیں زیادہ مشکل مزاحیہ اشعار لکھنا ہے۔ اس رنگ میں اکبر مرحوم سے زیادہ کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور ہر شعر میں جان ہے۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کیلئے نہیں لکھے گئے بلکہ ہنسی ہنسی میں چٹکیاں بھی لی ہیں۔ اور شکر لپیٹ کے کونین کی گولیاں کھلا دی ہیں۔ خوش مذاقی ایک نہایت ٹیڑھا راستہ ہے۔ قلم کی ذرا سی لغزش مضمون کو مزاح سے ہٹا کر بیہودگی میں داخل کر دیتی ہے۔ خوش مذاقی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آورد نام کو نہو۔ بظاہر یہ معلوم نہ ہو کہ صرف مزاح کی غرض سے یہ مضمون یا شعر لکھا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک آدھ لفظ یا فقرہ اس میں ایسا آجائے کہ دل میں اتر جائے

اور بے اختیار مسکراہٹ پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر کھیل جائے۔ چونکہ مجھے اپنی شاعری کا ہر رنگ دکھانا ہے۔ اسلئے خوش مذاقی کے چند شعر نمونہ کے طور پر لکھدیتا ہوں لیکن اسکے ساتھ یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ یہ رنگ میں نے بالجبر اختیار کیا ہے۔ اسلئے پھیکا ہے۔

اتنا تو بتا مجھ کو اے غمزہ جانانہ   ہے یار کی یہ محفل یا کوئی شفاخانہ
تقلید میں یورپ کی رسمیں یہ نئی نکلیں   ایٹ ہوم ہے پھولوں میں جاموں میں ہے عصرانہ
دعوے محبت پر یہ حکم ملا مجھ کو   پہنچا دو بریلی کو یہ شخص ہے دیوانہ

داڑھی تو منڈاتے ہو مونچھیں بھی صفا کردو
جب نکلیگی اے فرحت کچھ صورت مردانہ

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ایک شعر ہے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

یہی شعر غزل ذیل کے مطلع کی بنیاد ہے۔ عرض کیا ہے۔

قحط سے اوسان یاروں کے بجا ہونے تو دو   ہونگے عاشق ایک ذرا سستا سما ہونے تو دو
ان مسوں کے عشق کا کچھ دن میں آئیگا مزا   پہلے سر فرمایشوں سے پلپلا ہونے تو دو
ارتقائے قوم کی ہے منزل آخر قریب   گھٹ کے کھدر سے بدن پر بوریا ہونے تو دو
اے بتانِ مغربی۔ ہے حسن کا پردہ لباس   کم سے کم گونوں کو اپنی جانگیا ہونے تو دو
بیویوں کو اپنی تم گھر سے نکلنے دو ذرا   پھر مزا آئے گا۔ انکو بے حیا ہونے تو دو

خیر سے فرحت بھی پڑھنے کو غزل آئے ہیں آج
نکتہ چینی ہم کریں گے کچھ بڑا ہونے تو دو

ایک مشاعرے میں طرح ہوئی تھی "ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے" اس میں غزل ہوئی تھی۔

غضب ہے وہ میری فریاد سنکے کہتے ہیں   کبھی سنی ہے یہ آواز بھی کہیں میں نے

صنم کدہ میں کوئی بات تو ہے اے واعظ — جو اپنی عمر گزاری ہے سب یہیں میں نے

اسی میں ایک مزاحیہ شعر ہوا تھا۔

تیری نظر کی بھی وہ چوٹ ہے معاذ اللہ — ملا ہے سینہ پہ برسوں ہی تا پہ میں نے

ایک دوسری طرح کی غزل میں شعر ہوئے ہیں۔

جو مبصر ہیں وہ جڑتے ہیں دھڑا دھڑ اعتراض — قدر ہوتی ہے ہنر کی بے ہنر کے سامنے
جب کہا میں نے کہ میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا — رکھ دیا ظالم نے پتھر میرے سر کے سامنے
نامہ بر کو ڈھونڈتا پھرتا ہے فرحت کس لئے — دیکھ وہ ہے ڈاکخانہ تار گھر کے سامنے

مہاراجہ بہادر کے ہاں طرح ہوئی تھی "دل ناداں تجھے کیا ہوا ہے" اس مشاعرہ میں میں نے تین غزلیں پڑھی تھیں۔ ایک ریختہ میں دوسری ریختی میں اور تیسری مزاحیہ رنگ میں۔ ریختی کا رنگ تھا۔

چل پرے ہٹ تو گھورتا کیا ہے — تو نے مجھ کو سمجھ لیا کیا ہے
شیخ جی تم پہ ہو خدا کی مار — تم کو اس عمر میں ہوا کیا ہے
نوج ایسی کسی کی ہو اولاد — ایک آفت ہے چھوکرا کیا ہے

بہرحال بڑی لمبی غزل ہے۔ مزاحیہ رنگ کے شعر ملاحظہ ہوں۔ مطلع ہوا ہے۔

ان مسلمانوں کو ہوا کیا ہے — پوچھتے ہیں کہ کربلا کیا ہے

اور قطعہ ہوا ہے۔

پوچھا لیلیٰ نے جا کے مجنوں سے — سچ بتا تجھ کو ہو گیا کیا ہے
کونسی ایسی مجھ میں خوبی ہے — مجھ میں کہہ تو سہی دھرا کیا ہے
کوتہ گردن ہے تنگ پیشانی — رنگ کے سامنے تو کیا ہے
عمر میں بھی بڑی ہوں میں تجھ سے — اور موٹاپے کا پوچھنا کیا ہے
کہا مجنوں نے واہ مس لیلیٰ — پڑھ کے سب کچھ ڈبو دیا کیا ہے
اپنی مرضی ہے اور اپنی پسند — گورے کالے کا دیکھنا کیا ہے

اور بے اختیار مسکراہٹ پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر کھیل جاے۔ چونکہ مجھے اپنی شاعری کا ہر رنگ دکھاتا ہے۔ اسلئے خوش مذاقی کے چند شعر نمونہ کے طور پر لکھدیتا ہوں لیکن اسکے ساتھ یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ یہ رنگ میں نے بالجبر اختیار کیا ہے۔ اسلئے پھیکا ہے۔

اتنا تو بتا مجھ کو اے غمزہ جانانہ — ہے یار کی یہ محفل یا کوئی شفا خانہ
تقلید میں یورپ کی رسمیں یہ نئی نکلیں — ایٹ ہوم ہے پھولوں میں جہلم میں ہے عصرانہ
دعوے محبت پر یہ حکم ملا مجھ کو — پہنچا دو بریلی کو یہ شخص ہے دیوانہ

داڑھی تو منڈاتے ہو مونچھیں بھی صفا کردو
جب نکلیگی اے فرحت کچھ صورت مردانہ

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ایک شعر ہے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

یہی شعر غزل ذیل کے مطلع کی بنیاد ہے۔ عرض کیا ہے۔

قحط سے اوسان یاروں کے بجا ہو نہ تو دو — ہونگے عاشق ایک ذرا سستا سا ہو نہ تو دو
ان مسوں کے عشق کا کچھ دن میں آئیگا مزا — پہلے سر فرمائشوں سے پلپلا ہونے تو دو
ارتقائے قوم کی ہے منزل آخر قریب — گھٹ کے کھدرسے بدن پر بوریا ہونے تو دو
اے بتان مغربی۔ ہے حسن کا پردہ لباس — کم سے کم گونوں کو اپنی جانگیا ہونے تو دو
بیویوں کو اپنی تم گھر سے نکلنے دو ذرا — پھر مزا آئے گا۔ انکو بے حیا ہونے تو دو

خیر سے فرحت بھی پڑھنے کو غزل آئے ہیں آج
نکتہ چینی ہم کریں گے کچھ بڑا ہونے تو دو

ایک مشاعرے میں طرح ہوئی تھی "ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے" اس میں غزل ہوئی تھی۔

غضب ہے وہ میری فریاد سنکے کہتے ہیں — کبھی سنی ہے یہ آواز بھی کہیں میں نے

صنم کدہ میں کوئی بات تو ہے ای واعظ ‏ جو اپنی عمر گزاری ہے سب یہیں میں نے

اسی میں ایک مزاحیہ شعر ہوا تھا ۔

تیری نظر کی بہی وہ چوٹ ہے معاذ اللہ ‏ ملا ہے سینہ پہ برسوں ہی تا پہ میں مینے

ایک دوسری طرح کی غزل میں شعر ہوئے ہیں ۔

جو مبصر ہیں وہ جڑ دیتے ہیں دہڑا دہڑ اعتراض ‏ قدر ہوتی ہے ہنر کی بے ہنر کے سامنے

جب کہا میں نے کہ میں سر پھوڑ کر مر جاؤنگا ‏ رکھدیا ظالم نے پتھر میرے سر کے سامنے

نامہ بر کو ڈہونڈتا پھرتا ہے فرحت کس لئے ‏ دیکھ وہ ہے ڈاکخانہ تار گھر کے سامنے

مہاراجہ بہادر کے ہاں طرح ہوئی تھی "دل ناداں تجھے کیا ہوا ہے" اس مشاعرہ میں مینے تین غزلیں پڑی تھیں ۔ ایک ریختہ میں دوسری ریختی میں اور تیسری مزاحیہ رنگ میں ۔ ریختی کا رنگ تہا ۔

چل پرے ہٹ تو گھورتا کیا ہے ‏ تو نے مجھ کو سمجھ لیا کیا ہے

شیخ جی تم پہ ہو خدا کی مار ‏ تم کو اس عمر میں ہوا کیا ہے

نوج ایسی کسی کی ہو اولاد ‏ ایک آفت ہے چھوکرا کیا ہے

بہر حال بڑی لمبی غزل ہے ۔ مزاحیہ رنگ کے شعر ملاحظہ ہوں ۔ مطلع ہوا ہے ۔

ان مسلمانوں کو ہوا کیا ہے ‏ پوچھتے ہیں کہ کربلا کیا ہے

اور قطعہ ہوا ہے ۔

پوچھا لیلیٰ نے جا کے مجنوں سے ‏ سچ بتا تجھ کو ہو گیا کیا ہے

کونسی ایسی مجھ میں خوبی ہے ‏ مجھ میں کہہ تو ہی دہرا کیا ہے

کوتہ گردن ہے تنگ پیشانی ‏ رنگ کے سامنے توا کیا ہے

عمر میں بھی بڑی ہوں میں تجھ سی ‏ اور موٹاپے کا پوچھنا کیا ہے

کہا مجنوں نے واہ مس لیلی ‏ پڑھ کے سب کچھ ڈبو دیا کیا ہے

اپنی مرضی ہے اور اپنی پسند ‏ گورے کالے کا دیکھنا کیا ہے

ہیرے اور کوئلہ میں سوچو تو کاربن کے سوا دوہرا کیا ہے

میرے ایک بھائی کی شادی ہوئی مگر ذرا بڑی عمر میں۔ وہ اپنے آپ کو بڑا خوش مذاق سمجھتے تھے۔ میں نے ایک مبارکباد بچیوں کو لکھدی تھی۔ عین شادی کے موقعہ پر وہ انہوں نے پڑھی۔ دولہ میاں بڑے جلے۔ سمدھنیں بہت کڑکڑائیں۔ مبارکباد کے چند شعر یاد رہ گئے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ دولہ کا نام نہیں لکھتا۔ مگر ان کا نام اور میرا نام ہم قافیہ ہیں۔ میرا ہی نام ڈالکر پڑھ لیجئے۔

چچا.... تمہیں شادی مبارک ہو مبارک بچی کیا یہ تو ہیں دادی مبارک ہو مبارک
خدا کے فضل سے دولہ میاں ہیں گرخراسانی تو دلہن بھی ہے بغدادی مبارک ہو مبارک
دلہن کو اتنا دبلا دیکھ کر دل سے دعا نکلی یہ موٹی ہو بڑھے بادی مبارک ہو مبارک
الٰہی ہوں نویں ہی ماہ سے اوپر تلے بچے بڑھے دنیا کی آبادی مبارک ہو مبارک

خیر اور تو کچھ نہیں ہوا۔ مگر آبادی بڑھنے والا مضموں واقعات کے لحاظ سے پورا اترا۔ بچارے اولاد کی زیادتی سے تنگ آگئے ہیں۔ اس رنگ میں میں نے سہرے بہت لکھے تھے۔ لیکن خود نہیں پڑھے دوسروں کو پڑھنے کے لئے دیدے۔ وہ خدا جانے انہوں نے پڑھ کر کہاں پھینک دئے۔ ایک سہرے کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے بڑا شاندار تھا مگر بالکل بے معنی۔ سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ جس محفل میں یہ سہرا پڑھا گیا اس میں بہت سے شعراء اور اہل علم موجود تھے۔ لیکن کسی نے محسوس نہیں کیا کہ اس سہرے کے کسی شعر میں بھی کوئی معنی نہیں ہیں۔ اور جب ان پر یہ ظاہر کیا گیا۔ تو انہوں نے سخت اختلاف کیا اور کسی طرح اس بات کو نہیں مانے کہ اس سہرے میں صرف لفظ ہی لفظ ہیں معنی کچھ نہیں۔ جب دوبارہ خاص طور پر ان کو سنایا گیا تو انہوں نے ہر شعر کے معنی قائم کر دئے۔ یہی شاعری کا رنگ ہے جسے شاعر اپنے شعر نہیں سمجھتا اور سننے والے سمجھتے ہیں۔ اس سہرے کا صرف ایک شعر یاد ہے۔

بفرطِ شوق شاید دیکھنے کو آپ کا سہرا ‌ ‌ ‌ ‌ چلے آتے ہیں پادردست سب اجرام افلا کی

ظاہر ہے کہ اسمیں "پادردست" بالکل بے معنی اور بھرتی کے الفاظ ہیں۔ لیکن ایک صاحب نے جن کی قابلیت میں خود تسلیم کرتا ہوں اسکی یہ صراحت کی کہ بچے انتہائی خوشی کے موقع پر ایک ٹانگ ہاتھ میں پکڑ کر صرف ایک ٹانگ پر پھدکتے ہیں۔ یہی مضمون اس شعر میں ادا کیا گیا ہے کہ اجرام فلکی باوجود اپنے وقار و عظمت کے تمہارے سہرے کو دیکھنے کے لئے ایسے بیتاب ہوگئے ہیں کہ اپنی ساری متانت کو بھول کر بچوں کی طرح ایک ٹانگ پر پھدکتے ہوئے آرہے ہیں۔ آپ یقین مانئے کہ شعر لکھتے وقت یہ مضمون میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ سہرا اگر مل جاتا تو میں اس کو یہاں ضرور نقل کرتا۔ اور ممکن تھا کہ اسکے اشعار دیکھنے کے بعد یہ بھی یاد آجاتا کہ ان اہل ادب نے ان کے کیا معنی ارشاد فرمائے تھے اور کس طرح ایک بے معنی سہرے کو اپنے علم کے زور سے بامعنی کر دیا تھا۔

اب میں اس رنگ میں صرف ایک غزل لکھ کر اپنی شاعری کے اس پہلو کو ختم کرتا ہوں۔

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم ‌ ‌ ‌ ‌ کہ دہرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم
اس بری طرح پھنسے مجمع اغیار میں ہم ‌ ‌ ‌ ‌ گھٹ کے دم رہ گئے کوچۂ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی منہ نہ لگائے ‌ ‌ ‌ ‌ کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہمنے مانا کہ سنہ نیس کی ہی فورڈ سہی ‌ ‌ ‌ ‌ کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں مگر کار میں ہم
چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے ‌ ‌ ‌ ‌ کیا ہوا اگر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم
مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ کچھ برے بھی نہیں بس دیکھو تو دو چار میں ہم
لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ بیٹھے رہتے ہیں کتابوں کے انبار میں ہم
شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانوں کا لباس ‌ ‌ ‌ ‌ ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم
کیا غضب ہے کہ عدو روز روا اُس میں پھریں ‌ ‌ ‌ ‌ اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئے ایک کار میں ہم
گر گئیں ہائے اب اس چرخ کی گگریں ساری ‌ ‌ ‌ ‌ چھید کر دیتے تھے جس سے کبھی دیوار میں ہم

میں نے تاریخیں بھی بہت کہی ہیں۔ میاں داغ کے سفر کی تاریخ تو آپ سن چکے۔ ایک دو تاریخیں اور سن لیجئے۔ سب سے پہلے وہ تاریخ لکھتا ہوں جو عدالت العالیہ کے افتتاح کے وقت میں نے کہی تھی۔ حضرت اقدس اعلیٰ نے عدالت العالیہ کا افتتاح فرمایا۔ اور عدالت کھولنے کیلئے ان کی خدمت میں ایک سونے کی کنجی پیش کی گئی۔ اسی کنجی کی یہ تاریخ ہے۔ عرض کیا ہے۔

مبارک انبساط و کامرانی کی یہ ساعت ہے — کہ دستِ شاہ میں اس وقت مفتاح عدالت ہے
ہوئی تاریخ کی جب فکر دامنگیر اے فرحت — ندا اقبال نے دی "یہ کلید فتح و نصرت ہے"
۱۳۲۸ ف

لالہ سری رام دہلوی میرے کرم فرما اور اردو زبان کے محسن تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ان کے آخری زمانہ کے حالات قلمبند کر کے رسالہ زمانہ میں چھپوائے تھے۔ اور آخر میں ایک قطعہ تاریخ بھی دیا تھا۔ وہ قطعہ تو اب میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ اس کا آخری شعر یاد رہ گیا ہے اور اسی میں مادہ تاریخ ہے۔

کہی میں نے تاریخ با روی زرد — سری رام بیکنٹھ باشی ہوئے
۱۳۳۲ — ۱۳۳۹ = ۱۳۳۲ + ۷ فصلے

مہاراجہ بہادر المتخلص بہ شاد کے دو صاحبزادوں کے عقد کی بھی تاریخیں نکالی ہیں۔ رقعہ کے ساتھ طلبی کا خط بھی آیا تھا۔ پہلے قطعہ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

شاد کا رقعہ ملا فرحت کو جب — دل میں جذبوں سے ہوا ایک ارتعاش
جی میں کہتا تھا وہ رہ رہ کر یہی — جا پہنچتا میں بھی اس محفل میں کاش
کشمکش میں پڑ گیا ہے اسکا دل — شوق ادھر ہے اور ادھر فکر معاش
شاد جیسا قدرداں اس کو بلائے — وہ نہ جائے اور بہانہ لے تراش
عذر بیجا وہ کرے۔ ممکن نہیں — ہاں مگر خدمت ہوئی ہے "دور باش"[1]

[1] "دور باش" ایک لمبا شہتیر ہوتا تھا۔ اس پر پھریرا اور بھالے لگے ہوتے تھے۔ یہ شہتیر شاہان دہلی کی سواری کے آگے آگے چلتا تھا تاکہ راستہ میں کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

عقد نصر اللہ کی سنکر خبر اسکو تھی تاریخ کی بیحد تلاش
بولا ہاتف یوں زبانِ حال سے شاد باش و شاد باش و شاد باش
۱۸۳۶ + ۹۹ = ۱۹۳۵ء ۱۸۳۶

اسی عقد سعید کی دوسری تاریخ[۹۹] ہوئی ہے

فضل خدا سے ہوگیا جب عقد نصر اللہ خاں ایک مہ جبیں دلہن ملی اور خانہ آبادی ہوئی
مژدہ سناتی یوں پھری بادِ صبا چاروں طرف شادی ہوئی۔ شادی ہوئی۔ شادی ہوئی شادی ہوئی۔

دوسرے سال دوسرے صاحبزادے خواجہ اسد اللہ خاں کی شادی ہوئی[۱۳۴۴ ف]۔ اس کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔

آج محفل کا رنگ ہے کچھ اور کیا صبا نے خبر سنا دی ہے
حبذا جوشِ انبساط و سرور بیخودی آج بے ارادی ہے
چھا کے ابر کرم نے محفل کو "کوششِ عیش" کی صلا دی ہے
چل کے بادِ صبا نے لذتِ عیش کیا کہوں کسقدر بڑھا دی ہے
لیکے ساقی نے ساغر و مئے ناب ق خوب دل کھول کر پلا دی ہے
اور مطرب نے بربط و نے سے فکر دنیا کی سب بُھلا دی ہے
کھل کے غنچوں نے زر فشانی سے بزم میں ایک جھڑی لگا دی ہے
دھویا شبنم نے سارا صحنِ چمن پھر صبا نے اسے جلا دی ہے
نرگس و گل نے حسن کی چادر صحنِ گلزار میں بچھا دی ہے
آبشاروں نے فیض کی گنگا چار سو باغ میں بہا دی ہے
لالہ و گل نے اپنی شوخی سے آگ سی ہر طرف لگا دی ہے
بلبل اور طوطیوں نے نغموں سے دھوم گلزار میں مچا دی ہے
خار گلشن سے گو نکالے گئے دل اعدا میں انکو جا دی ہے
اسلئے بڑھ گیا ہے "کیف چمن" اسد اللہ خاں کی شادی ہے
۲۰۳ ۱۱۴۲
ف
۱۳۴۵ = ۱۱۴۲ + ۲۰۳

آغا حشر کاشمیری نے مرکز ادب کے ایک پہلو کو بالکل تاریک کر دیا۔ مجھ سے بھی ان کی صاحب سلامت تھی۔ رسالہ چونچ نے حشر نمبر نکالا۔ اس میں میرا بھی ایک مضمون آغا مرحوم پر تھا۔ اور اس قطعہ تاریخ پر ختم ہوا تھا۔

حشر کے مرگِ ناگہانی پر — دوستوں کی عجیب حالت ہے
دیکھئے جسکو۔ ہے وہ نوحہ کناں — آہ لب ہے اُتری صورت ہے
کہے تاریخ ان کے مرنے کی — رنج سے کس کو اتنی فرصت ہے
کر دیا غم نے مجھ کو پژمردہ — یوں تو کہنے کو نام فرحت ہے
سوچتا تھا کہ اب کسی میں بھی — جانشینی کی قابلیت ہے
جب نہ نعم البدل ملا تو کہا — حشر کی موت ایک قیامت ہے

۱۵۸۱ ۱۳۵۴ = ۲۲۷ - ۱۵۸۱

اس تکلیف دہ واقعہ کا ذکر کرتے ہی ان رنج و غم کے واقعات کا خیال آگیا۔ جن کے آنسو بہانا ہر اہل دل کا فرض ہے۔ واقعاتِ کربلا کا نظم کرنا کچھ انہی لوگوں کا حق ہے جنہوں نے اس دشت کی سیاحی میں اپنی عمریں گزار دی ہیں۔ پھر بھی ہر شاعر ان واقعات کے متعلق اپنی بساط کے موافق بغرض ثواب تھوڑا بہت ضرور کہتا ہے۔ دو سال ہوئے۔ جب مہاراجہ بہادر کے ہاں مسالمہ کی مجلس تھی۔ مصرع تھا "نہ ہم زر لیکے آئے ہیں۔ نہ گوہر لیکے آئے ہیں"۔ میں نے بھی اس مجلس میں ایک سلام پڑھا تھا۔ اور سلام سے پہلے یہ رباعی عرض کی تھی۔

اسلام کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں — اور عشق خدا کا دم بھی سب بھرتے ہیں
لیکن یہ دکھا دیا شہ بیکس نے — جو عاشق صادق ہیں وہ یوں مرتے ہیں

سلام ملاحظہ ہو۔

نہ ہم زر لیکے آئے ہیں نہ گوہر لیکے آئے ہیں — پئے نذر حسین اشکوں کی چادر لیکے آئے ہیں

نابِ حر بھی کیا اچھا مقدر لیکے آئے ہیں — کہ لاشہ جنکا یوں ہاتھوں پہ سرور لیکے آئے ہیں
مقابل کون آسکتا ہے شہ کی حق پرستی کے — جو راہِ حق میں کٹوانے کو گھر بھر لیکے آئے ہیں
ئی ایسا بھی ہے جسکی تمنا بر نہ آئی ہو — مرادیں لوگ کیا کیا تیری در پر لیکے آئے ہیں
دہر مرکب ہے ہمراہی گرا رن میں۔ ادہر اسکو — کمر پر راکب دوش پیمبر لیکے آئے ہیں
ر تیغ حسینی کا نہیں تھا خوف کچھ ان کو — تو اہل شام کیوں یہ لاؤ لشکر لیکے آئے ہیں
ملی اکبر کو دیکھو اور یہ ضعف افگنی دیکھو — کہاں کا زور یہ اللہ اکبر لیکے آئے ہیں
ہ روکو ظالموں انکو کہ پیاسوں کیلئے پانی — بڑی مشکل سے عباس دلاور لیکے آئے ہیں
ضعیفی اور یہ صدمے پیاپے۔ بس نہ کچھ پوچھو — کہ شہ لاشہ علی اصغر کا کیونکر لیکے آئے ہیں

نہیں یہ شعر فرحت داستانِ غم کا نوحہ ہے
لگانے کو دلوں پر ہم یہ نشتر لیکے آئے ہیں

اب اپنی فارسی اور اردو غزلوں کا کچھ انتخاب دیکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ شعروں کا انتخاب بڑی مشکل چیز ہے شاعر تو سمجھتا ہے کہ میرا ہر شعر اچھا ہے۔ اب رہے پڑھنے والے تو ہر ایک کی طبیعت مختلف ہوتی ہے۔ ایک شعر بعضوں کو پسند آتا ہے۔ بعضوں کو بالکل پسند نہیں آتا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ غزل میں ایک آدہ شعر چوٹی کا ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ تو صرف ایک شعر کی خاطر غزل پوری کرنی پڑتی ہے۔ میں انتخاب کرنے میں ہر غزل کے کئی کئی شعر لیتا ہوں تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ شاعروں کی فہرست میں گھسنے کے لئے اس نے چھانٹ کر شعر لکھدئے ہیں۔ اگر موجودہ طریقۂ انتخاب پر عمل کیا جائے تو اڈو تو اور خود میں بھی شاعر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ درانحالیکہ میں مانتا ہوں کہ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں ہے اور جو کچھ لکھا گیا وہ محض دوسروں کے اصرار پر لکھا گیا ہے۔ اور مجھے شاعر بنانے میں مہاراجہ بہادر سب سے زیادہ پیش پیش ہیں۔ ع چل رہے خامہ بسم اللہ۔ سب سے پہلے چند رباعیاں سن لیجئے۔

۱

یہ یاد رہے مجھ کو ستانے والے
خوش رہتے نہیں ہیں ظلم ڈھانے والے
پروانوں کے ساتھ دیکھ خود جلتی ہے شمع
او شمع کے مانند جلانے والے

۲

یوں انجمن آرائی سے حاصل کیا ہے
احباب کا جمع کرنا مشکل کیا ہے
فرحت نہ ہو جس بزم میں وہ بزم ہی کیا
ہو شاد نہ دل جس میں وہ محفل کیا ہے

۳

پیری سے یہ پیغام قضا کا پہنچا
منزل پہ تو اے رہرو دنیا پہنچا
بویا تھا جو بیج۔ ہے وہ کھیتی تیار
ہشیار! کہ ہنگام درو آ پہنچا

۴

اغیار مجھے جاہل و ناداں سمجھے
احباب بھی آشفتہ و حیراں سمجھے
احسان نہ کیوں شاد کا مانوں فرحت
جو مجھ کو سخن فہم و سخنداں سمجھے

۵

اغیار سے تکلیف نہ کیا کیا دیکھی
احباب سے بھی رنجش بیجا دیکھی
ان ٹھوکروں ہی کو تو ہیں دنیا کہتے
فرحت ابھی کیا تم نے ہو دنیا دیکھی

۶

فرحت[1] مجھے محشر کا نہ کیا کچھ ڈر تھا
بندوں سے مگر حساب لینا کیا
بس یہ ہوئی داد و ستد جرم و کرم
اُسنے کہا "دے" اور کہا میں نے کہ "لا"

---

[1] یہ رباعی قدسی کے اس شعر پر مبنی ہے۔
قدسی ندانم چوں شود سودائے بازار جزا
او نقد آمرزش بکف من جنس عصیاں در بغل

۷

گو شاعری سے مجھ کو سروکار نہیں — شاعر ہوں میں کسطرح کہ بیکار نہیں
کہہ لیتا ہوں کچھ شوق میں یونہی فرحت — تحسین کسی کی مجھے درکار نہیں

۸

کیوں ہوتے ہو تم مفت میں رسوا و تباہ — یہ عمر تمہاری اور یہ شوق گناہ
بس چھوڑو خدا کے لئے ان باتوں کو — لاحول ولا قوت الا باللہ

۹

جو مرد ہیں بیشک انکے سر جاتے ہیں — دنیا میں مگر نام وہ کر جاتے ہیں
نامرد جو ہیں انکی نہ پوچھو فرحت — مرنے سے کہیں پہلے وہ مر جاتے ہیں

۱۰

زر چاہتا ہوں میں۔ نہ گہر چاہتا ہوں — دنیا کے بکھیڑوں سے مفر چاہتا ہوں
میں کچھ نہیں چاہتا۔ مگر اے شہ دیں — بس ایک عنایت کی نظر چاہتا ہوں

اب غزلوں کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

اللہ رے۔ ویرانگی بارگہ عشق — یہ قصر وہ ہے جسمیں در و بام نہیں ہے
ہر ظلم پہ یاد آتی ہے گزری ہوئی راحت — کیا مجھ کو اسیری میں یہ آرام نہیں ہے

نقش پائے رہرواں رہبر ہیں کوئے یار کے — ورنہ صحرائے طلب میں راہ اور منزل نہیں
اس ادا کے ساتھ اسکی ضد کا آخر کیا جواب — شرم سے گردن جھکالی ہے مگر قائل نہیں

ہیں امید ہے اس سے وفا کی — خدا کی شان ہے قدرت خدا کی
ہو جب سارا زمانہ اس کا طالب — تو کیا باقی رہے وقعت دعا کی
کھنچا جاتا ہے دل پھر جانب مے — میری توبہ نے شاید پھر دغا کی
ہے کیا جام فنا میں کس کو معلوم — مگر لذت سی ہے آب بقا کی

۱۴۵۶۲

ستم اسنے کئے غیروں پہ فرحت — میری تقدیر بگڑی اور بنا کی
سنکڑوں ہیں تو بے نقاب آجا — دیکھ پھر کون تاب لاتا ہے
رنج کے بعد ملتی ہے راحت — انقلاب انقلاب لاتا ہے
مجھ پہ ہر روز ایک نئی آفت — دل خانہ خراب لاتا ہے
مفلسی میں نہ پوچھ اے فرحت — کیا مصیبت شباب لاتا ہے
کھو کے دل - اس بزم سے میں یوں چلا — جیسے کوئی کارواں لٹ کر چلے
منتظر ہیں ہم ان کے آنے کے — یہ بہانے ہیں جان جانے کے
انکی گرد قدم کو دعوے ہیں — آسماں پر زمین بنانے کے
جوش جنوں میں کیا کوئی شوریدہ سر ہے آج — یارب یہ کیسی جنبش دیوار و در ہے آج
ساقی ہے ۔ مے ہے ۔ ابر ہے اور رند شاد کام — کس مست کی دعا کا یہ آخر اثر ہے آج
فرحت مٹایا چرخ نے اہل کمال کو — اہل ہنر وہی ہے کہ جو بے ہنر ہے آج
قسمت سے مل گیا ہے تجھے اس کا آستاں — مرنا کہیں ضرور ہے زاہد یہیں سہی
اچھے بُرے سے کام نہیں اہل ذوق کو — سجدہ کو عرش گر نہیں ملتا زمیں سہی

قطعہ

گیا ہے بھول انساں اسقدر کچھ اصل کو اپنی — کہ بہکے جسقدر تحقیق میں اسکی وہ تھوڑا ہے
بتاتا مادہ کو ہے کوئی تخلیق کا باعث — کسی کی ابتدائے نسل میں بندر کا جوڑا ہے
کوئی پڑ کر تناسخ کے مباحث میں ہوا گمراہ — کسی نے آدم و حوا پہ رشتہ لا کے چھوڑا ہے
مگر صوفی ہیں میری رائے میں ان سب سے کچھ آگے — کہ کل عالم سے رشتہ توڑ کر خالق سے جوڑا ہے

کبھی ہے فکر معاش ہمکو ۔ کبھی ہے گھر کی تلاش ہمکو — ہوئی جو روزی ہے مطمئن ہم ۔ تو باغ میں آشیاں نہیں ہے
کبھی جو کرتا ہوں آہ و نالہ ۔ تو دل میں پڑتا ہے میرے چھالا — یہ کون کہتا ہے کہنے والا ۔ میری مؤثر فغاں نہیں ہے
بتائیں کیا ہمکو اپنی حالت ۔ گزرتی ہے روز ایک قیامت — یہی سمجھتے ہیں ہم تو فرحت کہ گردش آسماں نہیں ہے

جان سے ہاتھ اٹھایا ہم نے — ناز ہم سے نہ قضا کے اُٹھے
گردش چشم سے تیرے ساقی — جام مے چرخ میں آکے اٹھے
ہے میری خاک کو یہ شوق عروج — کہ بگولوں کو دبا کے اٹھے

دشوار اگر سمجھو تو ہر کام ہے آساں — آسان سمجھ لو تو پھر آسان نہیں رہتا
کیوں عہد وفا اسکو جتاتے ہو ہمیشہ — ظالم کبھی زحمت کش پیماں نہیں رہتا

بڑھایا اور اس نے شوق دیدار — خدا رکھے سلامت پاسباں کو

نہ کر قسمت پہ اپنی ناز تو اے پیر میخانہ — کہ جھکی ہے میری تقدیر سے تقدیر میخانہ
شراب ناب کیا ہوگی سمجھ لے اس سے تو زاہد — کہ دردے کو جب کہتے ہیں سب اکسیر میخانہ
یہ کس آتش بجاں کی روح پیاسی ہوکے آئی ہے — کہ ساقی ہل رہی ہے خود بخود زنجیر میخانہ
کھنچے آتے ہیں بوئے مے پہ کیا رندان لب تشنہ — اسے کہتے ہیں دیکھ اے محتسب زنجیر میخانہ
یہاں چھوٹے بڑے کا فرق مٹ جاتا ہے ای فرحت — کہو اعجاز اس کو یا کہو تاثیر میخانہ

طلبگار جور و جفا ہوگیا — الٰہی میرے دلکو کیا ہوگیا
یہ آنے لگیں کیوں مجھے ہچکیاں — کوئی نالہ شاید رسا ہوگیا
یہ کیا بھید ہے تو ہی واعظ بتا — کہ جو اسنے منہ سے کہا ہوگیا

فکر دنیا سے نہ فرصت ایک پل ہم کو ملی — ختم یونہی ہوگئی آخر بہار زندگی
رنج و راحت عیش و عسرت خوشدلی و غم سے ہے — اس جہاں کی کارگہ میں پود و تار زندگی
سینکڑوں ارماں۔ ہزاروں شوق لاکھوں حسرتیں — ساتھ اپنے لیچلے ہیں ہم یہ بار زندگی
ہائے فرحت عمر یہ۔ اقوال یہ افعال یہ — سچ تو یہ ہے زندگی تیری ہے عار زندگی

اس طرح ہوگیا ہے تو دیوانۂ حیات — گویا لکھا کے لایا ہے پروانۂ حیات
کیا آنکھ بند کرتے جوانی گذر گئی — کس بیخودی میں لٹ گیا میخانۂ حیات
دی ہے خدا نے آنکھ تو دنیا سے لے سبق — ہر ذرہ ہے یہاں کا ایک افسانۂ حیات

ہنستا ہوا نہ گورِ غریباں سے تو گزر — عبرت کا ہی مقام یہ ویرانۂ حیات

کچھ اسکی بزم میں یہ عجب انتظام ہے — رہ رہ کے ہر برائی مجھ ہی پر تمام ہے
فکرِ معاش بندۂ الم ہے بجائے خود — ہر ذی حیات کیلئے دانہ ہی دام ہے
فرحت کبھی تھی گردشِ افلاک پاؤں میں — اور اب تو ہر قدم پہ ہمارا مقام ہے

اس طرح میں ایک مزاحیہ شعر ہوا ہے۔

کوثر پہ لطف آئیگا کیا خاک تجھکو شیخ — جب ایک چلو میں تو یہاں اولٹام ہے

قطعہ

اگر رہتا ہے تجھ سے دور فرحت — تو پھونکے دیتا ہے سوزِ نہانی
اگر آتا ہے وہ محفل میں تیری — تو پڑتی ہے مصیبت یہ اٹھانی
تجھے دیکھے تو ڈر رہتا ہے اس کا — نہ پھر جائے کہیں عزت یہ پانی
اگر وہ دیکھتا ہے اور جانب — تو پھر ہوتی ہے تجھ کو بدگمانی
غرض دونوں طرح ہے اسکی مشکل — بمحفل گر بخوانی ور برانی

ملکِ عدم کے رہرو اس طرح جا رہے ہیں — ہستی سے نیستی تک اک کارواں ہے گویا
آفت نئی ہے آتی ہر روز دل کے ہاتھوں — میرے لئے تو دل بھی اک آسماں ہے گویا
کیونکر ہو اسکے در تک فرحت میری رسائی — اسکی گلی میں جو ہے اک پاسباں ہے گویا

اے نظر فریفتہ عشق کچھ اور چیز ہے — اس کو جمال و زینت و ناز و ادا سے کیا غرض
بس گئیں جس دماغ میں عشق کی سربلندیاں — اس سرِ بے نیاز کو ظلِ ہما سے کیا غرض
فرحتِ جاں نثار جب تیرا ہوا تو پھر اسے — مہر و وفا سے کام کیا جور و جفا سے کیا غرض

نہیں میرا قصور اس میں مگر یہ رنگ لائیگا — تیرا یوں ظلم کرنا اور میرا خاموش ہو جانا
ہماری داستانِ عشق کا بس یہ خلاصہ ہے — تمناؤں کا مایوسی سے ہم آغوش ہو جانا
نہ بھولیگا نہ بھولیگا کسی کے شوق آمد میں — ہر اک آہٹ پہ وہ میرا سراپا گوش ہو جانا

یکھ کر خود دار مجھ کو اسنے جب اُلٹی نقاب   راز میرا کُھل گیا اس پردہ در کے سامنے
وش میں کہتا تھا کچھ مُنہ سے نکل جاتا تھا کچھ   کیا مجھے خفت ہوئی ہے نامہ بر کے سامنے
یکھتے ہیں اپنی وہ تصویر یارب خیر ہو   اک نیا فتنہ کھڑا ہے فتنہ گر کے سامنے

گر نہیں ناز یہ تو پھر کیا ہے   صدقہ اس تیری بے نیازی کے
بولے وہ سن کے قصۂ فرہاد   یہ نتیجے ہیں جلد بازی کے
چارہ سازی کے تیری میں قرباں   اور پھر ایسی چارہ سازی کے

سب امیدیں ناامیدیں ہو گئیں   اور نہ میری سعی لاحاصل گئی
تھی کچھ عزت ابتداء عشق میں   وہ بھی آخر خاک میں سب مل گئی
دل ہلا اس کا نہ میری آہ سے   عرش کی زنجیر تک گو ہل گئی
بوالہوس کے خون دل میں ڈوب کر   آبروئے خنجر قاتل گئی
سب کو کندن کر گئی اس کی نظر   اب تمیز ناقص و کامل گئی
آرزوئے دل کہاں اور میں کہاں   ساتھ دل کے آرزوے دل گئی
دیکھ کر تجھ کو سکون دل ہوا   موج اٹھی تا لب ساحل گئی

تو کہے۔ اور میں تیرے کوچہ میں پھر رکھوں قدم   کیا کروں اس دل کے ہاتھوں میں بہت مجبور تھا
رند پہنچے تھے جہاں۔ زاہد بھی آخر آگیا   پھیر کا تھا راستہ۔ ہاں اسلئے کچھ دور تھا
کون ہے جسکو یہاں دعویٰ خدائی کا نہیں   دار پر چڑھنے کو فرحت کیا فقط منصور تھا

گزشتہ راحتوں کو اپنے دل میں یاد کرتے ہیں   ہم اس اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کرتے ہیں
ذرا تو ہی بتا صیاد۔ ہم تیری محبت میں   کبھی بھولے سے بھی اب آشیاں کو یاد کرتے ہیں
چلیئنگے میکدہ۔ مسجد میں واعظ کی بھی کچھ سن لیں   ذرا دیکھیں تم آخر آپ کیا ارشاد کرتے ہیں

قطرہ دریا میں جا ملا فرحت   موت صرف ایک انقلاب ہوئی

ابر ہے ساقی ہے مے ہے جوش ہے فرحت مجھے   واہ ناصح اب نصیحت اور پھر حضرت مجھے

میکشی اچھی نہیں ۔ یونہی سہی اے ہمنشیں
خیر اب تو پڑ گئی جو پڑ گئی عادت مجھے

دو جہاں کا غم سمٹ کر آدمی کا دل بنا
دل بنا کیا ۔ یوں کہو ایک عقدہ مشکل بنا

شوق دید شمع میں جب صورت بسمل بنا
تب کہیں پروانہ جا کر درخور محفل بنا

پرتوے حسن ازل سے کل جہاں معمور ہے
پہلے اپنے آپ کو تو عشق کے قابل بنا

کم نہیں ہیں شمع سے کچھ محفل اغیار میں
سر سے پا تک جل گیا جب رونق محفل بنا

کارواں گم جسم خستہ ۔ پاؤں زخمی ۔ راہ دور
میں وہ رہرو ہوں کہ جسکا ہر قدم منزل بنا

آسمانوں سے جو بار امانت اٹھ سکا
میں اسے ناحق اٹھا کر ظالم و جاہل بنا

"رب ارنی" اور لب موسیٰ پہ آتا کیا مجال
کچھ تو گھبراہٹ تھی اور کچھ شوق بیتابانہ تھا

عیش کے ساتھی ہیں سب خاموش بس عندلیب
تو کبھی آتی بھی تھی یہ باغ جب ویرانہ تھا

نفسی نفسی پر قیامت کے نہ کیوں اعتقاد
بزم میں آتے ہی تیری ایک سے ایک بیگانہ تھا

رات دن کی آہ و زاری اتنے ان کا رنج و غم
یا الٰہی کیا بنا تھا آسماں میرے لئے

دیکھنا کس وقت وہ بالیں پہ میری آئے ہیں
جب نگاہ یاس ہو گویا زباں میرے لئے

میکدے آتے میں واعظ آپکے کچھ راز ہے
ورنہ یہ تکلیف اور پھر مہرباں میرے لئے

سمجھو تقدیر اسے یا کہو وحشت کا اثر
میں گلستاں میں بھی جاؤں تو بیاباں ہو جائے

کیا ہو قدر دل ہمارا تیرے کوچہ میں
جہاں ایمان سی شے اسقدر ارزاں ہو جائے

دیکھ اے پیر مغاں فرحت میکش کو نہ تو
اتنا ترسا کہ وہ کمبخت مسلماں ہو جائے

کیا وہ آزاد جو دنیا سے الگ ہو بیٹھے
بات جب ہے کہ علائق میں بھی آزاد رہے

میں قفس میں بھی اس آزاد سے کچھ بہتر ہوں
جسکو دن رات سدا خطرۂ صیاد رہے

بہت ہے ناز تجھے اپنی بے زبانی پر
مزا تھا میں بھی جو تجھ سا ہی بے زباں ہوتا

ہے آدمی کی طبیعت وہ انقلاب پسند
کہ غم کو ڈھونڈتی گر عیش جاوداں ہوتا

کس شان کے ساقی نے میخانے بنا ڈالے — جو ٹوٹے ہوئے دل تھے پیمانے بنا ڈالے
دل ایک کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے — اس کعبہ میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے
مذہب کے یہ سب جھگڑے بس اس لئے برپا ہیں — سمجھے نہ حقیقت کو افسانے بنا ڈالے
اے پیر مغاں ہم ہیں قائل تیری جدت کے — مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے
میں کچھ نہ سہی فرحت اس قوم کا ہوں لیکن — فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

اگر میں نے واقعی کوئی شعر کہا ہے تو یہ پیر مغاں والا شعر ہے۔ جس پہلو سے دیکھو مکمل ہے۔ تمام مذاہب میں اکثر باتیں ملتی جلتی ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اتنے سارے مذہب دنیا میں چل رہے۔ جو کوئی نیا مذہب یا نیا فرقہ نکالتا ہے۔ کسی کامیاب مذہب کے نمونہ پر اس کی بنیاد ڈالتا ہے اور لاکھوں آدمیوں کو اس مشابہت کی وجہ سے اپنا کر لیتا ہے۔ جاپان والے ولایت کی چیزوں کی ہمشکل چیزیں بناتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ چیزیں نکل جاتی ہیں۔ گو تھوڑے ہی دنوں میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتی ہیں۔ بہت سے نیم حکیم اپنی وضع حکیموں کی بنا لیتے ہیں لوگ انکی وضع قطع دیکھ کر ان کے پھندے میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اپنی جانیں کھو بیٹھتے ہیں جاہل واعظ جبّہ و دستار میں آکر خدا جانے کیا کیا خرافات بک جاتے ہیں۔ اور بچارے بے پڑھے لکھے لوگ ان کی باتوں کو صحیح سمجھ کر مذہب کو کیا سے کیا کر دیتے ہیں غرض دنیا میں دھوکا دہی کی جتنی صورتیں ہیں وہ سب اس شعر میں آجاتی ہیں۔ اس شعر کو اس کے اصلی معنی میں بھی لو تو لطف سے خالی نہیں۔ یعنی جو لوگ ان مسجد نما میخانوں سے نکلیں ان کے متعلق ہر دیکھنے والا سمجھے کہ نماز پڑھ کے اندر سے آرہے ہیں۔ اور زاہد بھی اگر اندر جاتے ہوئے دیکھے جائیں تو کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہو کہ یہ پینے جا رہے ہیں۔

مقطع میں مغلوں کی ایک رسم کی طرف اشارہ ہے۔ فتح کے بعد یہ لوگ اپنے دشمنوں کے کاسہ سر میں شراب پیتے تھے۔ چنانچہ کئی فغفوروں کے سر ان مغلوں کے

پیمانے بن چکے ہیں۔

بتا پیرِ مغاں خالی ہو تیرا میکدہ کیونکر — کہ تھوڑے مست ہیں باقی جو ہیں ہشیار بیٹھے ہیں
نہیں رہتی خبر اس جلوہ گاہ ناز میں یہ بھی — کہ ہم ہیں عرش پر یا ہر سر بازار بیٹھے ہیں
بڑھا چل اے دل صبر آزما راہِ محبت میں — وہ کیا پہنچینگے منزل تک جو ہمت ہار بیٹھے ہیں
بھلا کس منہ سے پھر غیروں کا میں شکوہ کروں فرحت — کہ جب اپنے ہی میرے درپئے آزار بیٹھے ہیں

زمانہ کی کشاکش سے بہت آسان ہے چھٹنا — مگر ہم سے نہیں ممکن ادھر تو ہے ادھر دل ہے
نہو مرگ عدو پر اسقدر خوش اے دل ناداں — اگر یہ اسکی منزل ہے تو آگے تیری منزل ہے

اسی مضمون میں شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا شعر ہے۔ مرا بمرگ عدو جائے شادمانی نیست
کہ زندگانی ما نیز جاودانی نیست۔

ہم اس بحرِ جہاں کی کشمکش میں پڑ گئے اے فرحت — جہاں کچھ پاؤں ٹکتا ہے سمجھتے ہیں کہ ساحل ہے

نہیں کرتیں نہیں کرتیں اثر کچھ بھی تری دل میں — میری آہیں جو اکثر جا لڑی ہیں برق خرمن سے
الٰہی خیر کیجو تو ہمارے آشیانے کی — کہ بجلی کے چمکتے ہی اٹھا ہے شور گلشن سے
تو نرمی سے گزارہ اس جہاں میں اسطرح کر لے — بدلتی رہتی ہے پانی کی صورت جیسے برتن سے
کند پرواز چوں ہمجنس با ہمجنس اے فرحت — تو پھر کیوں دشمنی ہے اہلِ فن کو صاحب فن سے

اے اشک صبر کر کہ یہ تیرا نصیب ہے — اس کا جو ظلم خاص تھا اب عام ہو گیا
دیکھو تو سب قصور ہے میری نگاہ کا — اور دل غریب مفت میں بدنام ہو گیا
بدناموں میں کوئی بھی میرا نہ تھا شریک — افسوس۔ اب تو غیر بھی بدنام ہو گیا

خیال آجاتا ہے جب مجھکو اس زلف پریشاں کا — ہوا میں اڑنے لگتے ہیں نکل کر تار دامن سے
نبھیگی مری اور چارہ گر دونکی کس طرح فرحت — رفو کا شوق انکو اور مجھ کو عار دامن سے

بنا ہے اسلئے دل سوزشِ نہاں کیلئے — کہ بار کچھ تو ہو کم دوشِ آسماں کیلئے
یہ مانا خضر سے آبِ حیات مل بھی گیا — کہاں سے لاؤنگا غم عمر جاوداں کیلئے

جو عرض کرنی ہو کرلے نگاہِ شوق تو ہی   نہ مدعا کوئی باقی رہے زباں کے لئے
فلک مخالف و دل بیقرار و ہجر نصیب   اب اور چاہئے کیا مرگِ ناگہاں کے لئے
جگر کو درد فغاں دل کو آنکھ کو آنسو   پہنچ رہا ہے جو قسمت ہوا جہاں کے لئے
ہوں وہ مسافرِ گم کردہ کارواں فرحت   جو دوڑا پھرتا ہے ہر سمت کارواں کیلئے

کم ہے کیا مجھ کو گردشِ تقدیر   گر نہیں دورِ آسماں نہ سہی
دشمنی میں تو کچھ کلام نہیں   خیر وہ مجھ پہ مہرباں نہ سہی
سُن تو لیں عاشقوں کا وہ انجام   نہ سہی میری داستاں نہ سہی
غم اٹھانے کو اب بھی کیا کم ہے   گر نہیں عمرِ جاوداں نہ سہی

بدل آہ فسردہ را اثر نیست   بدریا آبِ مردہ را گزر نیست

آبِ مردہ ایسے دریا کو کہتے ہیں جو سمندر میں نہیں گرتا۔ کہیں ریت ہی میں خشک ہو کے رہ جاتا ہے۔

بیا ساقی بدہ جامم پیاپے   کہ در عالم مرا کارے دگر نیست
بہر جا بنگری طور یست لیکن   چو موسیٰ ہر کسے صاحب نظر نیست
گزیند اہلِ جوہر تربیت را   ببیں ہر قطرۂ نیساں گہر نیست
بساطِ عیش با خوبان بافگن   کہ فرحت زندگی بار دگر نیست

اسی مضمون میں بابر کا شعر ہے۔ نو روز و نوبہار و مے و دلربا خوش است۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

یہاں سے وہ غزلیں شروع ہوتی ہیں جو میں نے گلبرگہ شریف کے زمانہ قیام میں لکھی ہیں۔

سر میرا ایک ہاتھ میں اتارا   تو نے تو بڑا ہی تیر مارا
کیا تنگ ہے بحرِ زندگانی   وہ لیجیے آ گیا کنارا

سہہ سہہ کے ظلم میں نے گھر کر لیا ہے دلمیں
اب یہ نہیں ہے ممکن۔ تم مجھ کو بھول جاؤ

سامان کر رہے ہیں ہم سینکڑوں برس کا
اور یاں لگا ہوا ہے دن رات چل چلاؤ

دل تو گیا بلا سے اب اس کا ذکر ہی کیا
ایمان و دین کی اپنے اب خیر تم مناؤ

عاشق کی مغفرت کی کرتے سبھی دعا ہیں
للہ تم بھی کچھ تو اپنی زباں ہلاؤ

اب سمجھے دل لگانا کچھ دل لگی نہیں ہے
کہتے تھے اسلئے ہم فرحت نہ دل لگاؤ

ترش رومئی دلیل خامی ہے
میوۂ ترش خام ہوتا ہے

غیر کرتے ہیں بزم کو برہم
اور میرا ہی نام ہوتا ہے

فیصلہ کرتا ہے کون اپنے خلاف
تجھ سے پھر تیری شکایت کیا کریں

یہ تمہارا حال۔ اسکا وہ مزاج
اب بتاؤ تم ہی فرحت کیا کریں

بہت ہوتی اسے میری فغاں ایک
اگر قسمت سے ہوتا آسماں ایک

جگہ دلمیں کہاں اب حسرتوں کی
کہ لاکھوں میہماں ہیں اور مکاں ایک

ہیں قصے عشق کے کچھ ایک ہی سے
زمانے مختلف ہیں۔ داستاں ایک

ہمارا عشق میں ہو کر مخالف
غضب ہے ہو گیا سارا جہاں ایک

وہ انساں کیا کہے کچھ اور کرے کچھ
زباں جب ایک ہے رکھے زباں ایک

یونہی رہنے دے میرے آشیاں کو
ق یہی ہے عرض تجھ سے باغباں ایک

نہیں تو یاد رکھ آہ و فغاں سے
میں کردونگا زمین و آسماں ایک

جام مے بوالہوس نے پھر تو لیا
خیر سے گھونٹ بھر بھی پی نہ گئی

قتل پر میرے وہ پشیماں ہے
ظلم پر بھی تو سادگی نہ گئی

کرتی ہے دلسے نکلی دلمیں اثر
پھر میری آہ کو ہوا کیا ہے

اسقدر جور و ظلم ہمنے سہے
ہم نہیں جانتے جفا کیا ہے

ابتدا میں ہوں جسکے غش موسیٰ
ایسے جلوے کی انتہا کیا ہے

واسطہ کیوں خدا کا دوں اسکو — جو نہیں جانتا خدا کیا ہے
کیا کہا "ہم ہیں عہد کے پابند" — خیر چھوڑو۔ یہ تذکرہ کیا ہے
دار و منصور پر ہے حیرت کیوں — اور انجام عشق کا کیا ہے

پڑھنے کو بٹھا اسے نصیبن — لونڈا ہے تیرا بڑا ہی سرتا
اس طرح سیو گی خاک بنّو — دن بھر میں اٹھایا ایک کرتا

اندنوں ربط ہے پھر شیشے سے پیمانہ کو — ساقیا کہہ تو سہی کیا ہے بہار آنے کو
نہیں کعبہ کہ تمہیں راہ کی زاہد ہو تلاش — راہیں جتنی ہیں وہ سب جاتی ہیں میخانے کو
واعظوں۔ فرحت مسکیں کو تم ہی سمجھاؤ — یوں تو سمجھاتے بہت ہم بھی ہیں سمجھانے کو

کیا تھی شب فراق میں تاب و تواں کی جانکنی — زہر ہی ایک علاج تھا وہ بھی تو ہم نہ کھا سکے
پہلے ہی اپنی جان سے جو کوئی ہاتھ دھو چکا — میں بھی تو دیکھوں کوں اسے در سے تیرے اٹھا سکے
عشق کی میری کچھ خبر انکو ہو ورنہ کہتے کیوں — بھولنا ہے تو بھول جا مجھ کو اگر بھلا سکے
بزم غنا میں فرحت اب اردو کی شب مشاعرے — وہی غزل پڑھے یہاں تھوڑا بہت جو گا سکے

لکھنے کو یہ مقطعہ لکھ تو گیا۔ مگر یہ خود اپنے اوپر بھی چوٹ ہے۔ کیونکہ میں بھی ذرا لَے سے غزل پڑھتا ہوں اور وہ اس لئے کہ اس طرح گا کر پڑھنے سے دوسروں کو تقطیع کی غلطی پکڑنے میں دشواری ہوتی ہے۔ جہاں ذرا سکتہ ہوا کسی لفظ کو کھینچ کر مصرعہ برابر کر دیا۔

وہ جان جان ہی نہیں ہو جو جانستاں نہ ہوا — وہ آسماں ہی نہیں ہے جو آسماں نہ ہوا

آنے کا جب ارادہ کرتا ہے باغ میں تو — آجاتی ہے اسی دم ایک جان سی چمن میں
یہ جو وطن کا رونا ہے رات دن تمہارا — عزت تھی کیا تمہاری یہ تو کہو وطن میں

نکلی صورت نہ کچھ رہائی کی — ہر طرح قسمت آزمائی کی
کیا بتائیں کہ کیسے ہیں مجبور — ہم نے ہر در پہ جبہ سائی کی

کیا خدا ہوگا جسکے بندوں نے
بندگی میں سدا خدائی کی

یہ حسینوں میں شان صلِّ علیٰ
شان ہے تیرے کبریائی کی

بے وضو جام مے کبھی نہ پیا
ہم نے رندی میں پارسائی کی

دل مرا غم سے کب فگار نہیں
گھر میں کس دن میرے بہار نہیں

اپنے وعدے پہ اس ستمگر کو
میں تو کیا خود بھی اعتبار نہیں

ہم تو پہلے ہی کہتے تھے فرحت
عشق کچھ تم کو سازگار نہیں

در بزم ماندہ این تشنہ کامے
ساقی ہم او را للہ جامے

ہر خال رویش چوں دانہ ہست
ہر تار زلفش بر دانہ دامے

بر آستانش این ست کارم
گاہے سجودے گاہے قیامے

بند غلامی ہر کس کہ بگسست
گشتہ دو عالم او را غلامے

در مہر شکلش خنداں چو مینا
در قہر رویش آتش بجامے

از جور و ظلمش تا کے بسازم
آخر فلک را باید نظامے

این ست گیسو بر خط رویش
دامیست پنہاں یاز بر دامے

مارا ز دست کوتاہ ساقی
ہر ماہ باشد ماہ صیامے

آہستہ برداشت از رخ نقابے
گشتہ ہلالے ماہ تمامے

از صحبت تو فرحت جذبا بہ
بدنام گردد ہر نیک نامے

پاسباں نے مجھ کو پہچانا نہ تھا
کہتے کہتے جاتے میں کیا کہہ گیا

کیا کہوں کیا چیز تھی اس کی نظر
ایک نشتر تھا کہ دل میں رہ گیا

چمن دہر میں ہوں خار چمن کی مانند
یعنی بیکار ہوں اور پھر بھی میں بیکار نہیں

جب نہ رہی امید وصل پھر کوئی جی کے کیا کرے
ایسے تو بد نصیب کا خاتمہ ہی خدا کرے

چارہ گروں کے ہاتھ سے جان میری بتنگ تھی
موت نے آ کے دی نجات اسکا بھلا خدا کرے

موت میں جو ہیں لذتیں ان کی کسی کو کیا خبر
سن لے کہیں جو چارہ گر مرنے کی خود دعا کرے

دام میں اسکے آکے پھر جور و جفا کی فکر کیا
ہونا تھا جو وہ ہو چکا ہونا ہی جو ہوا کرے

ابر سیاہ مست اُدھر۔ جام بکف وہ شوخ اِدھر
فرحت تشنہ کام پھر تم ہی کہو کہ کیا کرے

رسائی میری اور اس آستاں تک
ہے کچھ اسمیں بھی شوخی آسماں کی

وبال جاں ہوئی یہ زندگی ہی
نہ زاہد چھیڑ عمر جاوداں کی

رواں ہے قافلہ ملک عدم کا
اٹھی جاتی ہے خلقت سب یہاں کی

رہا نام و نشاں بھی گر کسی کا
وہ گویا گرد ہے اس کارواں کی

اٹھے سب اہل محفل اور ابھی میں
خوشامد کر رہا ہوں پاسباں کی

نہیں اپنی خبر واعظ کو لیکن
خبر دیتے ہیں حضرت آسماں کی

وہ بولے سنکے میرا قصۂ غم
ہے کیا آخر غرض اس داستاں کی

کہاں تعریف ہو سکتی ہے فرحت
زباں کی اور پھر تیری زباں کی

دل بیتاب صبر کر للّٰہ
دیکھ اپنے پرائے بیٹھے ہیں

کیا امید وفا کہ ہم ان کو
ہر طرح آزمائے بیٹھے ہیں

مے میں تلخی سہی مگر زاہد
آپ کیوں منہ بنائے بیٹھے ہیں

لوگ فرحت سے یار شاطر کو
بار خاطر بنائے بیٹھے ہیں

نہ بھولونگا کبھی وہ درد دل کی داستاں کہنا
عدو کا روکنا اور ان کا وہ ہر بار "ہاں" کہنا

ہوئی مدت کہ ان سے بند ہیں میری ملاقاتیں
کہاں کا حال دل سننا کہاں کی داستاں کہنا

فلک کو جو ہلا دیتی تھی وہ لب تک نہیں آتی
ہے تو ہیں فغاں میری فغانکو اب فغاں کہنا

نگاہیں انکی تصدیق محبت کر کے کہتی ہیں
"مگر دیکھو کسی سے تم نہ راز نہاں کہنا"

اسی عادت سے تیری تنگ کیا کیا پڑے جھگڑے
یہاں سننا وہاں کہنا وہاں سننا یہاں کہنا

خدا ہی اب بچائے تجھ کو اسکے خون ناحق سے
نہ مانا تو نے بلبل کا غرض اے باغباں کہنا

"بہشت آنجا کہ آزاری نہ باشد" گر مثل سچ ہے — تو پھر لازم ہے میخانہ کو ہم رنگ جناں کہنا
وفا و مہر سے اسکو یہاں تک ہوگئی نفرت — کہ سن سکتا نہیں وہ اب کسی کا مہرباں کہنا
نہیں آساں کچھ آداب مجلس میرزا فرحت — بڑی مشکل سے آتا ہے کہاں سننا کہاں کہنا

ایک تو مجھ کو نکالا بزم سے — اور شکایت ہے کہ آئے پھر نہ کیوں
ظرف کا اپنے رہیں گر رند پاس — دور ساغر مجھ تک آئے پھر نہ کیوں
دیکھ کر بگڑی ہوئی قسمت میری — آسماں بھی رنگ لائے پھر نہ کیوں

آنکھوں آنکھوں میں کچھ ایسا کہہ گئے — سارے ارماں داغ بنکر رہ گئے
پاسباں نے اسکے پہچانا نہ تھا — کہتے کہتے جانے ہم کیا کہہ گئے
ولولے فرحت جوانی لے گئی — اب تو ہم کہنے کو زندہ رہ گئے

بنی تھی برق بھی کیا میرے ہی جلانے کو — لگا دی آگ جو چھٹتے ہی آشیانے کو
خدا ہی جانے کہ پڑتی ہے آگے کیا افتاد — لگا تو بیٹھے ہیں ہم اپنا دل لگانے کو
قفس میں روتے تھے کیا کیا ہم آشیاں کیلئے — اب آشیاں میں ترستے ہیں دانے دانے کو
جو تھیں جوانی کی باتیں۔ گئیں جوانی کیساتھ — مگر لئے ہوئے بیٹھے ہیں اس فسانے کو
سنی تو ہوگی مثل "جرب المجرب" کی — بس اور کیا کہوں اتنی ہی آزمانے کو
کہاں میں طائر آزاد اور کہاں یہ قفس — مگر میں کیا کروں قسمت کے آب و دانے کو
بس ایک ٹھکانا ہے ہم بیکسوں کا حیدرآباد — خدا سدا رکھے آباد اس ٹھکانے کو

مے میں تلخی سہی مگر زاہد — کیا کہوں جو سرور ہوتا ہے
اسکی محفل میں ہر برائی پر — ذکر میرا ضرور ہوتا ہے

عدو کا سر اور اس کا آستاں ہے — اے مرگ ناگہانی تو کہاں ہے
جہاں گردی مبارک تم کو ہو خضر — مرا خود کنج عزلت اک جہاں ہے
ابد کا موت کرتی ہے اشارہ — وہ منزل اور یہ منزل کا دھواں ہے

عشق اک امتحان ہے پیارے
کس مصیبت میں جان ہے پیارے

قتل ٹھیرا ہے امتحانِ وفا
یہ بھی کچھ امتحان ہے پیارے

کیا کہوں تجھ سے اپنا قصۂ غم
کچھ عجب داستان ہے پیارے

سرِ منصور گو ہے برسرِ دار
اس میں بھی ایک شان ہے پیارے

کبھی فرحت کے شعر سن تو لے
کیا ہی پیاری زبان ہے پیارے

گرے اپنی نظروں سے ہم خوار ہو کر
ابھی دیکھیں قسمت میں کیا خواریاں ہیں

قوٰی مضمحل ہو گئے سارے فرحت
یہ چلنے چلانے کی تیاریاں ہیں

مجھے محفل میں انکی جا کے پچھتانا ہی پڑتا ہے
مگر اس دل کے ہاتھوں کیا کروں جانا ہی پڑتا ہے

ہماری ساری خودداری مٹادی آرزوؤں نے
ہر ایک کے سامنے اب ہاتھ پھیلانا ہی پڑتا ہے

بس انکی بزم میں جانے کا زاہد شوق رہنے دے
کہ سنگِ آستاں کے بعد میخانہ ہی پڑتا ہے

جہاں میں ہر طرف پھیلا ہوا دامِ معیشت ہے
یہ وہ ہے جال جس میں سب کو پھنس جانا ہی پڑتا ہے

یہ مانا مے سے توبہ میں نے کرلی بھی تو کیا حاصل
وہ جب پیمانہ دیتا ہے تو پی جانا ہی پڑتا ہے

سمندر کا ہو زہرہ آب - وہ ہے آتشِ الفت
اگر اس آگ میں پڑتا ہے پروانہ ہی پڑتا ہے

کچھ ایسا جذب ہے ذاتِ کشن پرشاد میں فرحت
وہ بلوائیں نہ بلوائیں مگر جانا ہی پڑتا ہے

بعض وقت انسان ایسا بیوقوف ہو جاتا ہے کہ اپنی ہمت سے زیادہ کام کر بیٹھتا ہے ۔ حضرت اقدس داعلیٰ کی ہر غزل یوں تو لاجواب ہے لیکن ایک غزل کو دیکھ کر ایسا جوش آیا کہ خود بھی اس طرح میں غزل لکھدی ۔ اب اپنی غزل دیکھتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ یہ کیا بیوقوفی سوجھی تھی ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔ آپ بھی اس غزل کو ملاحظہ فرمائیے اور میری بیوقوفی کی داد دیجئے ۔

نہ ہمت ظلم سہنے کی نہ ہے تاب و تواں باقی
مگر ہے گردشِ تقدیر و دورِ آسماں باقی

تقاضا ہے میرے سجدوں پہ مری رشک کا مجھ سے
نہ تیرا سر رہے باقی نہ اسکا آستاں باقی

نہیں ممکن کہ میری گردش تقدیر سیدھی ہو — یہی ہے گر زمیں باقی یہی گر آسماں باقی
بوقت نزع وہ بالیں پہ میرے یوں نہیں آتے — نگاہ یاس کی صورت میں ہے میری زباں باقی
خوشا قسمت عجب مجھکو فراغت عشق نے بخشی — نہ کوئی راز باقی ہے نہ کوئی رازداں باقی
گئے ہیں اور نہ جانا ہی ملیگا اس کی محفل میں — عدو اندر ہے جبتک اور باہر پاسباں باقی
خدا ہی ہمکو منزل تک جو پہنچائے تو پہنچائے — نہ رہبر ہے نہ کوئی رہ نہ گرد کارواں باقی
قفس سے خیر ہم چھوٹیں نہ چھوٹیں تجھ کو کیا ہمدم — یہ کہدے تو کہ ہاں ابتک ہے تیرا آشیاں باقی
جو اچھے ہیں مصیبت میں بھی وہ اچھے ہی رہتے ہیں — برنگ تو خزاں میں ہے بہار بوستاں باقی
ذرا دیکھو مریض غم کو آخر کیا ہوا فرحت — نہ زاری ہے نہ نالہ ہے نہ آہ و فغاں باقی

اب اس انتخاب کلام کو ایک نظم لکھ کر ختم کرتا ہوں جسمیں حمد بھی آگئی ہے نعت بھی آگئی ہے۔ اور دعا بھی آگئی جس طرح اس کلام فرحت کا خاتمہ ہوا ہے خدا فرحت کا بھی اسی طرح خاتمہ بالخیر کردے۔

جب مجھ کو خیال حمد آیا — دل بید کی طرح تھرتھرایا
میں اور تیری ثنا کی جرأت — یہ کیا مجھے ہوگیا خدایا
ہے حکم میری ثنا کرو تم — اس حکم نے دل ذرا بڑھایا
رکھ کر سر عجز ترے در پر — لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا
اے وہ کہ تیری طواف کا شوق — گردش میں ہے آسماں کو لایا
کب عقل نے تیری کنہ پائی — کب فہم میں تو کسی کے آیا
اللہ رے تیرا حسن صنعت — ایک قطرہ کو آدمی بنایا
رفعت پہ تیری نظر جو ڈالی — جبریلؑ کے سر میں چکر آیا
جلوہ ہے تیرا وہ نور مطلق — ہے اور کبھی نظر نہ آیا
جس ذات کو پا سکا نہ ادراک — پایا تو بس اک بشر نے پایا

وہ کون کہ خاتم النبیینؐ — وہ کون کہ رحمتوں کا سایہ
وہ کون کہ سرور دو عالم — وہ کون کہ خادم البرایا
وہ کون کہ جسکی رہبری نے — گمراہوں کو راہ سے لگایا
وہ کون کہ جسکی پیروی نے — انسان کو آدمی بنایا
وہ کون کہ برزخ دو عالم — جسنے ہمیں حق سے جا ملایا
وہ کون کہ اسمہٗ محمدؐ — خالق کا درود جسپہ آیا
وہ کون کہ جسکی مرحمت نے — ہم جیسوں کا حوصلہ بڑھایا
فرحت کو ملا جو یہ سہارا — ہاتھ اسنے دعا کو پھر اٹھایا
اے بار الٰہ تیرے در پر — ہوں واسطہ میں نبی کا لایا
اس واسطہ سے مجھے لگا دے — جو تیرے جناب تک آیا
اس طرح نہ مجھ کو آزما تو — منظور کو جیسے آزمایا
دے کر مجھے پہلے ظرف عالی — اکشف بجالک الغطایا
وہ درد مجھے عطا ہو یارب — حصہ میں اویسؓ کے جو آیا

بس اور نہیں کوئی تمنا
جو قابل عرض ہو خدایا

یہ تو ہوا میرے کلام کا انتخاب اب سنئے کہ میں شعر کیونکر لکھتا ہوں۔ میرا بچپن تھا۔ مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ مدرسہ گھر سے کوئی دو میل تھا۔ راستہ میں ملکہ کا باغ پڑتا تھا۔ باغ میں نہر تھی۔ ایک روز جو ادھر سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شاعر صاحب نہر کے کنارے بڑے زوروں سے ٹہل رہے ہیں۔ کان میں قلم ہے سیدھے ہاتھ میں کاغذ ہے۔ بائیں ہاتھ میں ایک دوات ڈوری سے بندھی لٹکی ہوئی ہے ان کے ہر قدم کے ساتھ گھنٹہ کے لنگر کی طرح دوات جھکولے کھاتی ہے اور ان کی زبان سے دوات کے ہر

جھکولے کے ساتھ یہ الفاظ نکل رہے ہیں "آبِ رواں آبِ رواں آبِ رواں آبِ رواں"
معلوم ہوتا تھا کہ آب رواں کا مضمون کہیں چلتے چلتے رک گیا تھا اور کسی طرح بہنے کا نام
نہیں لیتا تھا۔ ان کو دیکھکر بڑی ہنسی آئی لیکن جب خود شاعری شروع کی۔ تو تھوڑا بہت
یہی رنگ میرا بھی ہوگیا۔ اب جب کبھی کوئی مضمون اڑکے رہ جاتا ہے اور مصرع کو الفاظ
بدل بدل کر بار بار پڑھتا ہوں تو ان شاعر صاحب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔
میرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی مصرع طرح پر غزل کہنی ہو تو پہلے دو ایک مرتبہ وہ مصرع پڑھا۔
اس کے بعد جس بحر میں وہ مصرعہ ہے اسکی پانچ چھ منٹ تک رٹ لگائی۔ اس کے بعد
اس بحر میں کوئی قافیہ اور ردیف ٹھونس دئے۔ اس طرح یہ بے معنی مصرعہ دو تین دفعہ
پڑھا۔ اتنے عرصہ میں اس قافیہ کے لحاظ سے کوئی مضمون دھیان میں آگیا۔ وہ ذرا الٹ
پلٹ کر جا دیا۔ چلو ایک مصرعہ ہوگیا۔ اسکے بعد دوسرا مصرعہ لگا کر شعر پورا کر دیا۔ مثلاً
ایک مشاعرہ میں مصرعہ طرح دیا گیا تھا "تمہیں میری قسم دیکھو کوئی برباد ہوتا ہے" دو ایک
دفعہ اس مصرعہ کو پڑھا کہ یاد رہے۔ اسکے بعد بجائے مصرعہ کے یہ بحر پڑھنی شروع کی
"مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" اس کو اتنی دفعہ پڑھا کہ بحر نوکِ زباں ہوگئی۔
اتنے میں "آزاد" کا قافیہ دل میں آیا۔ اور ردیف اور قافیہ کو ملا کر بحر میں داخل کر دیا۔ اب
جو مصرعہ پڑھا تو اسکی صورت ہوئی۔ "مفاعیلن مفاعیلن مفا آزاد ہوتا ہے" دو تین ہی
دفعہ اس کو پڑھنے کے بعد یہ اس طرح پورا ہوا "یہاں کی کشمکش سے کوئی بھی آزاد ہوتا ہے"
اس کے بعد دوسرا مصرعہ لگانا کچھ مشکل کام نہیں۔ کیونکہ لفظ "یہاں" دنیا کی طرف
اشارہ کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں شعر اس طرح پورا ہوگیا۔

نہ گھبرا اے دلِ مضطر یہی ہے رنگ دنیا کا یہاں کی کشمکش سے کوئی بھی آزاد ہوتا ہے

بہر حال میں تو اس طرح شعر کہتا ہوں۔ اب رہا یہ امر کہ یہ نسخہ دوسروں کو بھی فائدہ
دے سکتا ہے یا نہیں اس کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہاں میری تو یہ حالت ہے کہ اس طریقہ پر

مل کرنے سے آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ میں غزل پوری ہو جاتی ہے اور نہیں ہوئی تو جائے جہنم میں۔ کوئی ہم شاعری کے ہاتھ بک تھوڑی گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری جتنی غزلیں ہیں سب چلتی ہوئی ہیں۔ نہ مضمون مشکل ہے۔ نہ الفاظ مشکل ہیں اور نہ بندشیں مشکل ہیں۔ ذرا طبیعت الجھی اور غزل کو "سلام علیکم وعلیکم السلام" کہدیا۔

طرح کے علاوہ جو غزلیں ہیں۔ ان میں طرح کے انتخاب کی مصیبت میں اپنے اوپر نہیں لیتا۔ خدا بھلا کرے گراموفوں اور ریڈیو کا۔ اچھی سے اچھی طرحیں مل جاتی ہیں۔ طرحیں ملنی تو کیسی بہت سے قافیے معلوم ہو جاتے ہیں۔ میری رائے میں غزل کہنے کے لئے موٹر کا سفر سب سے اچھا موقعہ ہے۔ سفر اگر لمبا ہے تو کئی غزلیں ہو جائینگی۔ چھوٹا ہے تو چھوٹی بحر میں ایک آدھ چھوٹی سی غزل کا ہو جانا لازم ہے۔ موٹر کے ہچکولے اور اس کے چلنے کی آواز سے شعر کہنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بشرطیکہ موٹر چلانے والے صاحب ہارن کا بے ضرورت استعمال نہ فرمائیں۔ ورنہ ہارن کی کرخت آواز سے قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ نئی موٹر میں صاف اور سلجھی ہوئی غزلیں جن میں نہ قافیہ سخت ہو اور نہ ردیف مشکل کہی جا سکتی ہیں۔ البتہ اگر قافیے ٹرٹ یا کسی ایسے ہی سخت لفظ پر ختم ہوتے ہوں اور ردیف بھی دشوار ہو تو پھر پرانی موٹر میں بیٹھکر سفر کرنا چاہئے کیونکہ اس کی دھڑدھڑاہٹ ایسے قافیوں سے خوب میل کھاتی ہے۔

اب مجھے صرف ایک ہی بات لکھنی رہ گئی ہے یعنی یہ کہ میں نے اتنا بڑا مضمون کیوں لکھا۔ اور جب میں اپنے آپ کو خود شاعر نہیں مانتا تو بلا وجہ پڑھنے والوں کی سمع خراشی کیوں کی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے شاعر ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں ہے۔ ع ہر کہ شک آرد کافر گردد۔ مگر اسکو کیا کروں کہ میں شاعر نہیں بنتا۔ مگر میرے احباب مجھے زبردستی شاعر بنانا چاہتے ہیں۔ بعض لوگ زبردست شاعر ہوتے ہیں

اور میں زبردستی کا شاعر ہوں دوستوں کا تقاضا ہے کہ دیوان چھپواؤ۔ دیوان چھپواؤ۔ دیوان چھپوانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ آج کل شاعر دل ہی کو کون پوچھتا ہے جو انکے دیوانوں کو پوچھیگا۔ دیوان چھپوانیکے یہ معنی ہوئے کہ "نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ" اور اسکے لئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں تو ان مہربانوں کی کہنے کو ٹال جاتا۔ مگر مہاراجہ بہادر کے اصرار اور جلیل صاحب کے بار بار کہنے نے مجبور کر دیا۔ اسلئے دیوان تو نہیں چھپوایا مگر یہ "دیوان بچہ" چھپوا دیا۔ نظم میں نثر اسلئے ٹھونس دی کہ شعر پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جائے۔ بہر حال اسطرح میں اپنی ضد پر بھی قائم رہا۔ اور احباب کی فرمائش بھی پوری ہوگئی۔ مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ آپ اس کو پسند کرتے ہیں[۵] یا نہیں کرتے۔

تاریخ

ادا کس طرح شکر ہو شاد کا	کہ شاعر مجھے مفت میں کر دیا
نہ چھپواتا میں اپنا دیوان کبھی	مگر دوستوں کو بھی ضد ہوگئی
اگر ایک دو ہوں تو دوں کچھ جواب	تقاضے شدید اور پھر بے حساب
غرض ہو کے مجبور۔ دیوان سے	ہر ایک رنگ کے شعر کچھ کچھ لئے
نئی طرز اک اور ایجاد کی	کہ اس نظم میں نثر بھی ٹھونس دی
ملی "حق" سے تاریخ یہ لا "جواب"	کہ پورا ہو "جبر" سے "انتخاب"
۱۰۸ ۱۲	۲۰۵ ۱۰۵۴

۱۰۸ + ۲۰۵ + ۱۰۵۴ - ۱۲ = ۱۳۵۵ ہجری

---

۵ میرے ایک منہ بولے بھائی مرزا رفیق بیگ ہیں۔ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ وہ میری شاعری سے سخت نفرت کرتے ہیں اور خفا بھی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں "آکا" تمہاری شاعری نے تمہاری نثر نگاری کو بھی تباہ کر دیا۔ مضمون لکھتے تو کوئی پڑھتا بھی۔ اب یہ تمہارے شعر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ انہی حضرت نے اس مضمون کی تاریخ کہی ہے "آکا کی زبردستی کی شاعری" اس سے بہتر نہ تو اس مضمون کی تاریخ ہو سکتی ہے اور نہ اس سے بہتر ریویو۔ واقعی اگر کسی نے میرے دل کی بات کہی ہے تو انہوں نے کہی ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے اور مجھے اس شاعری کی مصیبت سے نجات دے۔

کاتب الحروف شیخ حسین شاہ آبادی معلم خطاطی عثمانیہ کالج گلبرگہ شریف